Regd. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1985

اس پرچہ میں

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو

یاز نورِ مصطفیٰؐ او را بہا است یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

معراج انسانیت شائع ہوگئی

(صفحہ ۱م)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور	بدلِ اشتراک سالانہ
۴ چار روپے		پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۹۸ روپے
شمارہ ۳	مارچ ۱۹۸۵ء	جلد ۳۸

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ انسانیت کا آخری سہارا (پرویز صاحب) ——— ۱۰

۳۔ فہرست کتب ——— ۳۹

۴۔ معراجِ انسانیت کا تازہ ایڈیشن ——— ۴۱

۵۔ ہم میں کریکٹر کیوں نہیں (پرویز صاحب) ——— ۴۲

۶۔ دُرِ منثور ——— ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر شیخ عبدالمجید، مقام اشاعت ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۷۔ ایبک روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

(۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کی یاد میں)

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں موسمِ بہار کی آمد کے ساتھ ہی، ہماری ملّی تاریخ کی دو اہم تقاریب منانے کے دن آتے ہیں۔ بہار کا موسم وہ ہے جس میں کائنات کے گوشے گوشے میں نئی زندگی نمود ہوتی ہے۔ شجرِ حیات کی ہر شاخ سے حسنِ خوابیدہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتا ہے۔ چٹیل میدانوں میں سبزۂ نورستہ اور خشک ٹہنیوں سے گلِ نو دمیدہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے اور ہر دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ...... فَانۡظُرۡ اِلٰۤی اٰثٰرِ رَحۡمَتِ اللّٰہِ کَیۡفَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ...... (۳۰/۵۰) "تم مبداءِ فیض کی نیساں باریوں اور گہر فشانیوں کو دیکھو کہ اس نے کس طرح زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کر دی۔" موسمِ بہار کی انہی حیات بخشیوں میں ہمارے سامنے ۲۳ر مارچ کا وہ یومِ سعید آتا ہے جب قوم کے قلوبِ مردہ میں ولولۂ تازہ کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے حصولِ آزادی کے عزمِ جواں بخت کا طنطنہ خیز اعلان کیا۔ اور اس کے بعد ۲۱ر اپریل کا وہ دن جب اس ولولۂ تازہ کا پیامبر، اپنا مشن پورا کر کے، اپنے سفر کی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ ان تقاریب کی عظمت و اہمیت کا تقاضا تھا کہ انہیں فلک بوس جوش و خروش اور عالمگیر شان و شکوہ سے منایا جاتا، لیکن جس قوم پر صدیوں سے جمود و تعطّل چھایا رہا ہو، ان کے ہاں ہر حیات بخش عمل محض رسم بن کر رہ جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ہمارے دین کے ایسے انقلاب آفریں عناصر ——— صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ ——— جنہوں نے انسانیت کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا تھا، کس طرح بے روح رسومات کا مجموعہ بن چکے ہیں۔ ان اعمالِ حیات کو بھی چھوڑ دیجئے، وہ کتابِ عظیم جس نے ان کی زندگی کے ہر گوشے میں قندیلِ راہ بننا تھا کس طرح محض الفاظ کا کاغذی پیکر بن چکی ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب اس التزام و تکرار و اصرار سے نہیں پڑھی جاتی جس طرح اس کتاب کی تلاوت ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہ الم انگیز حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ دنیا میں بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کے الفاظ تو اس طرح دہرائے جائیں لیکن ان میں سے کسی لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں۔ لاکھوں کروڑوں گھروں میں اس کی روزانہ تلاوت سے قطع نظر، ہزاروں، لاکھوں کے مجمع میں اسے ایک ایک رات میں اس طرح ختم کیا جاتا ہے کہ نہ پڑھنے والا اس کا ایک لفظ سمجھتا ہے، نہ سننے والے ——— اور تراویحوں اور شبینوں

کے علاوہ، اب تو گھر گھر قاریوں کے کیسٹ سنائی دیتے ہیں۔ ناظرہ قرآن پڑھانے اور قرأت و تجوید کی تعلیم دینے والے لاکھوں مکاتب کھلے ہیں جن میں اس کے الفاظ کی ادائیگی کے طور طریق سکھائے جاتے ہیں لیکن یہ کسی کو نہیں بتایا جاتا کہ ان الفاظ کے معانی اور مفہوم کیا ہے۔ جو قوم، اس قسم کی کتاب عظیم کے ساتھ یہ کچھ کر رہی ہو، وہ اگر اپنی ملی یادگاروں کو محض رسمی طور پر منائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؛ یہ بھی کچھ کم غنیمت نہیں کہ انہوں نے ابھی ان یادگاروں کو یکسر فراموش نہیں کر دیا!

جس طرح، ہماری معاشرتی (اور مذہبی) زندگی میں جس لفظ کو سب سے زیادہ بار دہرایا جاتا ہے، وہ اسلام ہے۔ لیکن آپ کسی سے پوچھ کر دیکھ لیجئے، اس کے ذہن میں اسلام کا کوئی متعین مفہوم نہیں ہوگا۔ اس طرح ہماری سیاسی زندگی میں (پاکستان کے حوالے سے) جن الفاظ کی سب سے زیادہ تکرار ہوتی ہے وہ "نظریۂ پاکستان" ہیں۔ اور لفظ اسلام کی طرح، نظریۂ پاکستان کے متعلق بھی کسی سے پوچھئے۔ وہ بتا نہیں سکے گا کہ اس کا مطلب کیا ہے؛ ہم آج کی نشست میں اسی "معمہ" کو لیتے ہیں۔

(٭)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کو قوتِ گویائی عطا کی گئی ہے۔ وہ اپنے مقصد کا اظہار الفاظ میں کر سکتا ہے۔ وَعَلَّمَہُ الْبَیَان۔ خود خدا کا ارشاد ہے۔ انسان کی تمدنی زندگی کا دار و مدار اسی خصوصیت پر ہے۔ لیکن یہ خصوصیت اسی صورت میں نعمت ہے کہ ہم جو لفظ بولیں، ــــ سننے والوں کے ذہن میں اس کا مفہوم متعین ہو۔ اگر ایسا نہ ہو، اور مختلف افراد ایک ہی لفظ کے معانی مختلف لیں، تو اس سے زندگی اجیرن ہو جائے۔ مثلاً آپ اس ماجرا پر غور فرمائیں کہ آپ نیم بے ہوشی کے عالم میں ہیں، شدتِ پیاس سے کہیں ــــ پانی ــــ اور آپ کے گھر والوں میں سے کوئی ماچس کی ڈبیہ لئے چلا آرہا ہو اور کوئی چمچہ ــــ ایک آپ کے سرہانے تولیہ لئے کھڑا ہو اور دوسرا بالٹی۔ کسی کے ہاتھ میں تیل کی شیشی ہو اور کوئی آپ کا جوتا تلاش کر رہا ہو ــــ سوچئے کہ اگر صورت یہ ہو تو خدا کی یہ نعمت (قوتِ گویائی) کس قدر عذاب بن جائے! یہ نعمت اسی صورت میں قرار پائے گی، جب آپ "پانی" کہیں تو ہر سننے والا اس سے "پانی" مراد لے۔

یہ مثال تو زندگی کے عام معمولات سے متعلق ہے۔ اسے ذرا آگے بڑھائیے اور سوچئے کہ آپ اہم مسائلِ حیات کے متعلق جو الفاظ یا اصطلاحات استعمال کریں، اگر سننے والوں کے نزدیک ان کا متعین مفہوم نہ ہو، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسے سمجھنے کے لئے آپ خود اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایک نظامِ حیات پیش کیا جسے اسلام کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ اس کا مفہوم اس قدر واضح اور متعین تھا کہ موافق، مخالف، ہر ایک سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ لیکن اس سے ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے یہ نقشہ آتا ہے کہ ہر شخص کی زبان پر اسلام ہے لیکن ہر شخص کے نزدیک اس کا مفہوم جداگانہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ وہی قوم جو اس اصطلاح کے متعین مفہوم سے اُمّتِ واحدہ تھی، فرقوں میں بٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ تاریخ میں مسلمانوں کے سینکڑوں فرقوں کا تذکرہ آپ کے سامنے آئے گا لیکن ان میں کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے یہ کہا ہو وہ اسلام کو چھوڑ کر کسی اور

دین کی دعوت دے رہا ہے۔ ہر ایک، اسلام کی طرف دعوت دینے کا مدعی تھا اور ہر فرقہ دوسرے کے دعویٰ کی تکذیب کرتا تھا۔ ماضی کو چھوڑیئے اور حال کی طرف آیئے۔ آج بھی مسلمانوں میں متعدد فرقے ہیں اور ان سب کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہیں اور اسی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر فرقہ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار قرار دیتا ہے اور دوسروں کے اسلام کو کفر بتاتا۔ اور ان میں سے کوئی شخص اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس کا دعوائے اسلام سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس اصطلاح کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں۔ ان اصطلاحات کے مفہوم کے عدمِ تعین کا مظاہرہ ہم منیر کمیٹی کی روئیداد میں دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے علمائے کرام سے کہا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ یعنی اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر تو اس سوال کا سرے سے کوئی جواب ہی نہ دے سکے۔ - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - اور جنہوں نے جواب دیا ان میں سے کسی کا جواب دوسرے کے جواب سے ملتا نہیں تھا۔ ان بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کے عدمِ تعین کا نتیجہ ہے کہ قوم اس قدر تشتت، وانتشار، اور فساد و خلفشار کا شکار ہو رہی ہے۔ ہر ایک کی زبان پر لفظ اسلام کا ہے لیکن ہر ایک کا راستہ جُدا جُدا اور منزل الگ الگ ہے۔ قرآنِ کریم نے تفرقہ کو جو شرک قرار دیا ہے ($\frac{30}{32}$) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خدا کے ساتھ بتوں کو پوجنے لگ گئے ہیں۔ توحید کے معنی ہیں ساری قوم کے سامنے ایک نصب العینِ حیات ہو (جو خدا کا متعین کردہ ہو) اور شرک سے مراد ہے ہر گروہ کا اپنا الگ نصب العین ——— یعنی اسلام کا اپنا اپنا مفہوم!

تشتت و انتشار کے عذاب میں گرفتار قوم کی ایک خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر وہ کبھی ان خرابیوں کے ازالہ کی فکر کرے، تو بجائے اس کے ان خرابیوں کے علل و اسباب پر غور کر کے انہیں دُور کرنے کی کوشش کرے، وہ ان میں ... ایک اور خرابی کا اضافہ کر لیتی ہے ——— جس طرح (مثلاً) فرقہ بندی کی خرابیوں کو دور کرنے کا خیال لے کر اٹھنے والا، ایک نیا فرقہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور پارٹیوں کے پھیلائے ہوئے فسادات کو مٹانے کا دعویدار، ان میں ایک اور پارٹی کا اضافہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ لفظ اسلام کے مفہوم کے عدمِ تعین سے گھبرا کر، قوم نے (بجائے اس کے کہ وہ اس اصطلاح کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرے) اب ان اصطلاحات میں ایک اور اصطلاح کا اضافہ کر لیا ہے اور وہ اصطلاح ہے ——— نظریۂ پاکستان ——— اس جدید اصطلاح کو وضع (یا اختیار) کئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس کے بھی اتنے ہی مفہوم ہو گئے ہیں جتنے مفاہیم لفظ اسلام کے تھے۔ اب ہر پارٹی نظریۂ پاکستان کے تحفظ کی مدعی ہے اور ہر پارٹی دوسری پارٹی سے، اس بنا پر برسرِ پیکار کہ نظریۂ پاکستان کے حامل ہم ہیں، فریقِ مخالف نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔

——————— (۰) ———————

پولیٹیکل سائنس (علم السیاسیات) کی رُو سے، مملکت (STATE) سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے افراد، ایک ہیئتِ اجتماعیہ (انفرادی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنے) کا تہیّہ کر کے ایسا نظم و نسق قائم کریں جس سے وہ ملک مستحکم ہو اور اس کے باشندے خوشحال اور ہر قسم کے خطرات سے مامون ——— اس مملکت کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ افرادِ مملکت کا تصوّرِ زندگی کیا ہے اور نظریات و معتقدات

کی قسم کے ہیں، یہ (اپنے) افراد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی مملکت کو قومی یا وطنی مملکت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مملکت کا ایک تصور قرآن نے دیا تھا اور وہ یہ کہ ایک قسم کا نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی رکھنے والے افراد، اپنی منفرد حیثیت اجتماعیہ متشکل کرنے کا فیصلہ اور عزم کریں۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ہندوؤں کے پیشِ نظر ایک قومی یا وطنی مملکت کا قیام تھا۔ اس کے برعکس تحریک پاکستان کے پیشِ نظر اس قسم کی مملکت کا قیام تھا جس کا تصور قرآن نے دیا تھا۔ اس کا صحیح نام تو قرآنی مملکت تھا لیکن غیر مسلموں کو سمجھانے کے لئے (نیز اسے تھیاکریٹک سٹیٹ سے متمیز کرنے کے لئے) پہلے علامہ اقبالؒ نے اور اس کے بعد قائدِ اعظمؒ نے، اسے نظریاتی مملکت (IDEOLOGICAL STATE) کہہ کر پکارا —— یعنی وہ مملکت جس کی بنیاد ایک خاص نظریۂ حیات (IDEOLOGY) پر ہوگی۔ اسی سے نظریۂ پاکستان (IDEOLOGY OF PAKISTAN) کی اصطلاح وجود میں آئی۔ یعنی ایسی مملکت جو ہمارے، آپ کے، یا ہندوستان میں بسنے والے افراد کی اکثریت کے، یا وہاں کی پوری کی پوری آبادی کے ذاتی خیالات، یا مقاصد کے مطابق متشکل نہیں ہوگی بلکہ قرآنی اقدار کے فروغ اور بلند مندی کے لئے وجود میں لائی جائے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے، ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہم ان مقامات میں "اسلام" کی جگہ "قرآن" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، لفظ "اسلام" کا مروجہ مفہوم، متعیّن نہیں رہا۔ اس لئے جب اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے تو کسی کے سامنے نہ کوئی متعیّن مفہوم آتا ہے، اور نہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی متعیّن کرنے کے لئے کس طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے برعکس جب لفظ "قرآن" استعمال کیا جائے تو اس سے ہر ایک کی نگاہ ایک خاص کتاب کی طرف اٹھتی ہے جس کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ ہے اور ہمارے لئے ابدی راہ نمائی کا ذریعہ۔ لہٰذا، اس ذہنی خلفشار اور نظری انتشار کے عالم میں "قرآن" کے لفظ سے، کم از کم توجہات ایک مرکز پہ تو مرکوز ہو جاتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ہم اسلام کے بجائے قرآن کا لفظ استعمال کیا کرتے ہیں۔ ورنہ اگر صدرِ اوّل کی طرح اسلام کا متعیّن مفہوم ہمارے سامنے ہوتا تو اسلام اور قرآن کے الفاظ کا عملاً مفہوم ایک ہی ہوتا —— اسلام اس نہج زندگی کا نام ہے جو قرآن کے مطابق بسر کی جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

چونکہ گروہ بندانہ مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) کہ قوم کے سامنے، اس کے نظریۂ حیات اور نصب العین زندگی کے متعلق کوئی متفق علیہ اور متعیّن مفہوم نہ آنے پائے، اس لئے قرآن کا نام سامنے لانے سے ان کی طرف سے یہ اعتراض وارد کر دیا جاتا ہے کہ قرآن بیشک ایک متعیّن کتاب کا نام ہے لیکن اس کتاب کا مفہوم تو متعیّن نہیں۔ اس کی تعبیر الگ الگ کی جاتی ہے لہٰذا، اس سے بھی انتشار اور خلفشار کی وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو لفظ "اسلام" سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ (انسانی تصانیف میں بھی) ایک عمدہ کتاب کی بنیادی خوبی یہ قرار دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح اور متعین طور پر سامنے لائے۔ اگر کوئی تحریر ایسے الفاظ میں منضبط ہو کہ وہ ہر شخص کو، اس کی منشاء کے مطابق (الگ الگ) معانی دے دے، تو وہ کتاب اٹھا کر پھینک دینے کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ جب انسانی تصانیف کے عمدہ ہونے کا معیار یہ ہے تو ایک ایسی کتاب جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ

کسی انسان کی نہیں، بلکہ انسانوں سے بلند و بالا، خود خدا کی تصنیف ہے، کیا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس کے الفاظ، مختلف اور متضاد معانی دینے کے قابل (E / B A P P C) ہوں؟ بالخصوص جبکہ اس کا دعویٰ یہ ہو کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات، نہیں ـــــ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝ ..... (۴/۸۲) "کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ اس میں غور و فکر سے کام لیں تو ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ اگر یہ کتاب خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں وہ بہت سے اختلافات پا لیتے ـــــ سوچیئے کہ جس کتاب، کا بنیادی دعویٰ یہ ہو کیا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ ہر ایک کو الگ الگ تعلیم دے؟

دوسری بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ایک حصہ وہ ہے جس میں اس نے انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی دی ہے (اور یہی حصہ اس کے بنیادی مقصد سے متعلق ہے) انہیں اصولِ حیات، یا مستقل اقدار کہا جائے گا ـــــ یہ اصول و اقدار بالکل واضح اور متعین ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہو سکتا۔ امورِ مملکت، کا تعلق اسی گوشہ سے ہے۔ قرآنی تعلیم کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق حقائق کائنات اور مابعد الطبیعاتی مسائل (META - PHYSICS) سے ہے۔ ان حقائق کے سمجھنے کا مدار، انفرادی فکر اور بہ ہیئت مجموعی انسانی علم کی سطح پر ہے۔ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی، یہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے اور کوئی شخص جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لے گا، وہ انہیں اسی قدر زیادہ عمدگی سے سمجھ سکے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ:۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْہِمَا مِنْ دَآبَّۃٍ ؕ
وَہُوَ عَلٰی جَمْعِہِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ۝ (۴۲/۲۹)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سماوات (زمین اور دیگر اجرامِ فلکی) کو پیدا کیا۔ اور ان میں ذی حیات، کو پھیلا دیا۔ اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے قانونِ مشیئت کے مطابق، زمین اور ان اجرام کے ذی حیات کو اکٹھا کر دے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کا مفہوم آج سے کچھ عرصہ پہلے کچھ اور لیا جاتا تھا اور آج (بالخصوص تسخیر قمر کے بعد) اس کا مفہوم واضح ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور جس دن کسی اور کرہ کے ذی حیات زمین پر لائے جائیں گے یا ہم وہاں جا سکیں گے تو اس آیت کا مفہوم متعین ہو جائے گا۔ اسی قسم کے حقائق ہیں جن کا صحیح مفہوم سامنے آنے کے سلسلہ میں فرمایا کہ:۔

سَنُرِیْہِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِہِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ
لَہُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ؕ ...... (۴۱/۵۳)

ہم انہیں، خارجی کائنات اور خود ان کی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ تا آنکہ یہ بات واضح طور پر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

یوں ان حقائق کا مفہوم متعین ہوتا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ان نشانیوں کے بے نقاب ہونے کے بعد بھی ان کا

مفہوم، ہر شخص کی علمی اور فکری استعداد کے مطابق اس کی سمجھ میں آئے گا۔

لیکن یہ شرائط بسیط حقائق کے مفہوم سے متعلق ہیں۔ جہاں تک انسانی زندگی کی راہ نمائی اور امورِ مملکت کا تعلق ہے، قرآنی اصول و اقدار کا مفہوم متعین اور واضح ہے۔ (مثلاً) جب وہ اسلامی مملکت کے متعلق کہتا ہے کہ — وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) — ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے — تو فرمایئے کہ اس اصول کا مفہوم سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے؟ (یاد رکھئے۔ قرآن، اصول دیتا ہے۔ ان اصولوں کو بروئے کار لانے کا پروگرام، ہر دور کی قرآنی مملکت خود متعین کرتی ہے)۔

لہٰذا، اگر نظریۂ پاکستان (یا اسلامی مملکت کے اصول و مبانی) کا تعین قرآن کریم کی رُو سے کیا جائے تو اس کے مفہوم میں کوئی الجھاؤ یا ابہام رہ سکتا ہے، نہ اختلاف یا تضاد پیدا ہو سکتا۔

———— (۰) ————

قرآن کریم کی رُو سے، اسلامی مملکت کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ اس میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے شخص کا محکوم ہوتا ہے نہ محتاج۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس در ایں جا سائل و محروم نیست　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں حکومت صرف خدا کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ اصول، وضاحت طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا خود حکومت کرنے کے لئے تو سامنے نہیں آتا، اس لئے سوال یہ پیدا ہوگا کہ خدا کی حکومت کس طرح قائم ہوگی؟ ایک حکومت تو شخصی ہوتی ہے یعنی مملکت کا پورا اقتدار ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ جو حکم دے، اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اس کی مملکت میں نہ کوئی شخص یہ جان سکتا ہے کہ اس (صاحبِ حکومت) نے کل کو کیا حکم دیدینا ہے نہ کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وہ حکم کیوں دیا ہے۔ اس اندازِ حکومت کو ملوکیت کہا جاتا ہے۔ قرآن، اس قسم کی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا، اس لئے "خدا کی حکومت" بھی ملوکیت کے انداز کی نہیں ہوتی۔ دوسرا اسلوبِ حکومت یہ ہے کہ اطاعت قوانین کی ہو اور قوانین کی غرض و غایت اور علت و حکمت کا ہر ایک کو علم ہو قرآن اسی نہج کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے، خدا نے ایک ضابطۂ قوانین دے دیا ہے جس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان قوانین کی حکمت اور غایت کیا ہے۔ اسی ضابطۂ قوانین (قرآن) کی اطاعت کا نام خدا کی محکومیت ہے اور یہی مومن اور کافر کا امتیازی نشان ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں

اور اس کے بعد، خود رسول اللہؐ سے ارشاد ہوا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ …… (۵/۴۸)

(اے رسول!) تو ان لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر۔ ان کے معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کر۔ اور جب یہ کتاب (الحق)، تمہارے پاس آ چکی ہے تو پھر انسانوں کے خیالات اور آرا کا اتباع مت کرو،

یہ ہے خدا کی حکومت قائم کرنے (یا اس کی محکومیت اختیار کرنے) کا عملی طریقہ۔ یعنی قرآنی اصول و اقدار کو حکومت کا آئین قرار دینا اور اس کے قوانین و ضوابط کو ملک میں نافذ کرنا۔ یہ وہ بنیادی حقیقت تھی جس کا اظہار علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ بار بار کرتے رہے۔ یعنی یہ کہ حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ مملکت میں، ہماری آزادی اور پابندی کے حدود، خدا کی کتاب کے اصول و احکام کی رُو سے متعین ہوں۔ بالفاظِ دیگر، نظریۂ پاکستان سے مراد ہے قرآن کی حکمرانی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے دین کی اساس و بنیاد اس حقیقت کو قرار دیا ہے کہ حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے اس نے ایک جامع فقرہ استعمال کیا ہے اور وہ ہے ——— لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ——— دنیا میں کوئی ہستی (شخص۔ گروہ یا ادارہ) ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے بجز اللہ کے۔ محکومیت صرف خدا کی اختیار کی جا سکتی ہے۔

حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب دین، مذہب سے بدلا تو، قرآن کے دیگر مہماتِ اصول کی طرح، اس بنیادی کلمہ کے معانی اور مفہوم بھی یکسر بدل گئے۔ اب ان الفاظ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ ——— "دنیا میں کوئی شئے یا ہستی پرستش کے قابل نہیں سوائے اللہ کے" ——— دین میں الٰہ سے مراد، صاحبِ اقتدار و اختیار تھا ——— مذہب میں اس کا مفہوم "پرستش کی شئے" ہو گیا۔ اسلام کا اساسی اصول، لا الٰہ الا اللہ کے مختصر لیکن بے حد جامع الفاظ میں مرتکز ہے اور اسی کو کلمہ یا کلمہ طیبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے معنی اصولِ محکم کے ہیں ——— جب دین میں اسے کلمہ کہا گیا تھا تو اس سے جو عملی نقشہ سامنے آتا تھا، اس کے متعلق قرآنی تصریحات اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہی کلمہ، ایک رسم بن کر رہ گیا، یا زیادہ سے زیادہ علم الکلام کا ایک مسئلہ۔ (یا اہلِ تصوّف کا سرِ باطن، جنہوں نے، "وحدت الوجود" کے فلسفہ کی رُو سے اس کے معنی یہ کر دیئے کہ دنیا میں کوئی معبود ایسا نہیں جو خود خدا نہ ہو۔ یعنی انسانوں نے جتنے معبود تراش رکھے ہیں وہ سب خدا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے اساسی اصول کو لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ سے تعبیر کیا ہے اور اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ، قرآنِ مجید کے احکام و اصول و اقدار کو حاصل ہوگا، کسی اور کو نہیں۔ لا الٰہ میں دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار شخص یا ادارہ کی نفی کی گئی ہے۔

لیکن ہمارے ہاں، جو حضرات اسلامی حکومت کے قیام اور نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے مدعی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس اساس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس اساس پر اُمّتِ واحدہ کی عمارت استوار ہوتی ہے جس میں نہ مذہبی فرقوں کی گنجائش ہوتی ہے نہ سیاسی پارٹیوں کے لئے کوئی جگہ ——— نہ جغرافیائی حدود کی بنا پر علاقائی تفریق روا رکھی جا سکتی ہے اور نہ نسلی امتیاز کی بنا پر کوئی تمیز۔ اس میں، ساری کی ساری اُمّت، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی (حزب اللہ) ہوتی ہے جس کے اندر فرقہ سازی یا پارٹی بازی، یا اسی قسم کی کوئی اور تفریق، شرک سمجھی جاتی اور حکمتِ فرعونی قرار پاتی ہے۔ (۳۲/۳۰) یہ وجہ ہے کہ

یہ حضرات (لفظ اسلام کی طرح) "نظریۂ پاکستان" کے الفاظ کو تو اس شد و مد سے دہراتے رہتے ہیں لیکن اس کا متعین مفہوم کبھی پیش نہیں کرتے۔ فرقہ بندیوں اور پارٹی بازیوں میں الجھی اور کھوئی ہوئی قوم، توحید خالص کی طرف آنا ہی نہیں چاہتی۔ قرآن کے الفاظ میں ـــ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۳۹/۴۵) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان لوگوں کے سامنے، جو آخرت کے منکر ہیں، خدائے واحد کا تصور پیش کیا جاتا ہے تو وہ سخت کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ اور جب خدا کے علاوہ، اوروں کا ذکر کیا جائے تو وہ ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ اہل جہنم سے کہا جائے گا کہ إِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ ۖ وَإِن يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا ـ ـ ـ ـ ـ جب تمہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم اس سے انکار کرتے تھے۔ اور جب اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کیا جاتا تھا تو تم اس اسلوبِ حکومت کو صحیح تسلیم کر لیتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ تھی (اور ہے) کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ۔ (۴۰/۱۲) حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ وہی علو اور کبریائی کا مالک ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے ا إِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا۔ (۱۷/۴۶) جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ، نفرت آگیں انداز سے منہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ خدائے واحد (یعنی قرآنِ خالص) کی حکمرانی کو نہ ہمارا مذہب پرست طبقہ گوارا کرتا ہے نہ سیکولرازم کا حامی گروہ ـــ نہ دیر میں، نہ حرم میں خودی کی بیداری ـــ کیونکہ اس سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے اور ان کے فرقے اور پارٹیاں باقی نہیں رہتیں۔ حتیٰ کہ ان کا حقِ حکومت بھی باقی نہیں رہتا۔ لیکن ان میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ یہ اپنے اس کفر و شرک کا اعلان یا اعتراف کریں۔ اس کے لئے انہوں نے ٹیکنیک یہ اختیار کر رکھی ہے کہ اسلام یا نظریۂ پاکستان جیسی اصطلاحات کا مفہوم متعین نہ کیا جائے۔ انہیں مبہم رکھا جائے۔

ہمارے ہاں یہ شعر جو زبان زدِ خلائق ہے کہ:

پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ!

معلوم نہیں کہنے والے کے سامنے اس کا وہ مفہوم تھا یا نہیں جو قرآن کریم کی رُو سے، اوپر بیان کیا گیا ہے، لیکن بات اس نے پتہ کی کہی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ پاکستان (یا اسلامی مملکت) کی اساس، لا الٰہ الا اللہ ہے۔ اور اس سے مراد ہے۔ خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی حکمرانی۔ یعنی وہ احکام اور قوانین جو ہر زمانے میں قرآنی مقاصد کو پورا کریں اور زمانے کی ضروریات کے مطابق بدلتے رہیں۔ یہی نظریہ پاکستان ہے۔

ـــ ۞ ـــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانیت کا آخری سہارا

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۶۷ء میں اپنا یہ خطاب پیش کیا تھا۔ دوبارہ اسے ۱۹۷۷ء میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ یہ پمفلٹ ایک عرصہ ہوا ختم ہو گیا لیکن اس کی مانگ بدستور چلی آ رہی ہے۔ اس تقاضا کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اسکا تازہ ایڈیشن شائع کر دیا جائے۔ سو وہ پیشِ خدمت ہے۔

خطاب

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی! سلام و رحمت!

قرآن کریم میں بیان کردہ قصۂ آدم کسی ایک فرد (یا جوڑے) کی داستان نہیں۔ وہ درحقیقت نوعِ انسان کی سرگذشت ہوتی تاریخ ہے جسے نہایت جاذب و دلکش تمثیل کے پیرایہ میں، بصیرت افروز و حقیقت کشا انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تمثیل میں آدم اور اس کی رفیقہ، انسان (مرد اور عورت) کے نمائندے ہیں، ملائکہ فطرت کی قوتیں ہیں جنہیں مسخر کر لینے کی صلاحیت انسان کو ودیعت کر دی گئی ہے اور ابلیس اس کی مفاد پرستی کے بے باک جذبات ہیں جو خود اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شیطان اور ابلیس ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ شیطان، انسانی جذبات کی شورش مزاجی کا مظہر ہے۔ (کہ اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں) اور ابلیس؛ اس افسردگی اور مایوسی کا ترجمان، جو بیر استعمال کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ (ابلیس کے بنیادی معنی مایوس کے ہیں)

منظر اس داستان کا وہ دور ہے جس میں پہلے پہل انسانی آبادی کی نمود ہوئی تھی۔ اس دور میں سامانِ زیست کی عام فراوانی تھی اور تمام انسان (جتنے کچھ بھی وہ تھے) ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے (وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً- ۱۰/۱۹) ان میں کوئی تفریق و تقسیم نہیں تھی۔ کوئی باہمی مخاصمت اور منازعت نہیں تھی، کسی قسم کے جھگڑے اور تضیئے نہیں تھے۔ اس لئے کہ وہ لوگ ابھی "میری اور تیری" کی تمیز سے ناآشنا تھے۔ وہ ایک ایسی جنت کی زندگی تھی جس میں کیفیت یہ تھی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا- (۲/۳۵) جس کا جہاں سے جی چاہتا، پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس وقت

ارض ـــــ یعنی ذریعۂ پیداوار ـــــ کی حیثیت متاع کی تھی۔ (۲/۳۶) یعنی استعمال کی شے، جس سے ہر ضرورت مند فائدہ اٹھا سکے لیکن وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔ وہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ تھی۔ (۴۱/۱۰) یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۲۰) اس وقت خدا کی بے مزد و معاوضہ عطا کردہ بخشش پر نہ بند باندھے گئے تھے، نہ پھاٹک کھڑے کئے گئے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ اس میں ہر انسان کو اس کا اطمینان حاصل تھا کہ: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اسے نہ بھوک کا خوف ستا سکتا تھا، نہ پیاس کا؛ نہ لباس کے متعلق کسی قسم کی پریشانی ہو سکتی تھی، نہ سکونت کے متعلق۔ اس زندگی میں انسان سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم سب ایک خاندان کے افراد ہو اس لئے تم ایک برادری بن کر رہنا۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) آپس میں مشاجرت اختیار نہ کر لینا۔ مشاجرت کے معنی ہیں ان چیزوں کا پھٹ کر الگ ہو جانا جو اصل کے اعتبار سے (شجر کی طرح) ایک ہوں۔

ابلیس کا وسوسہ

آدم اس سکون و اطمینان اور اس وحدت و اشتراک کی زندگی بسر کر رہا تھا کہ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ۔ (۲۰/۱۲۰) اس کے دل میں انفرادی مفاد پرستی کے سرکش جذبات نے انگڑائی لی اور اس کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ تجھے دوسروں کی کیا پڑی ہے۔ تو اپنی اور اپنی اولاد کی پرورش کی فکر کر۔ اس وسوسۂ شیطانی اور افسونِ ابلیسی کا نتیجہ یہ تھا کہ آدم کی وہ وحدت اور برادرانہ اشتراک کی زندگی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ (۲/۳۶) یعنی باہمی عداوت اور معاندت کی کیفیت ـــــ اَلْعِدٰی، اس لکڑی کو کہتے ہیں جو کسی لکڑی کو پھاڑ کر اس کے دونوں حصوں کے درمیان (WEDGE) کے طور پر دے دی جاتی ہے کہ وہ آپس میں مل نہ سکیں۔ اسے اَلْعِدٰی کہتے ہیں۔ یہ برادری پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی، اور ایک خاندان دوسرے خاندان کا رقیب و حریف بن گیا۔ جب انفرادی طور پر خاندانوں نے اپنے مفادات کو غیر محفوظ پایا تو چند خاندانوں نے مل کر قبیلہ کی شکل اختیار کر لی۔ اب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے مدِمقابل کھڑا ہو گیا۔ خود لفظ قبیلہ کے معنی ایک دوسرے کے مدِمقابل کے ہیں۔ اس طرح انسان، اس قدیم زندگی کو چھوڑ کر، جسے عصرِ حاضر، زمانۂ قبل از تمدن سے تعبیر کرتا ہے، دورِ تہذیب و تمدن میں داخل ہوا۔ جوں جوں یہ اس تہذیبی دور میں آگے بڑھتا گیا، اس کی یہ گروہ بندیاں، شدت اختیار کرتی گئیں۔ تا آنکہ اس تقسیم نے قبائل کی جگہ، اقوام (NATIONS) کی شکل اختیار کر لی۔ اسے انسان کی تمدنی زندگی کی معراج قرار دیا جاتا ہے۔

اس تمثیل میں، فطرت کی قوتوں (ملائکہ) نے جب انسان کے انفرادی مفاد پرستی کے جذبہ اور اس سے پیدا شدہ "میری اور تیری" کی تفریق پر نگاہ ڈالی تو زبانِ حال سے کہا تھا کہ اس

فساد انگیزیاں

کے ہیولے میں یہ دبی ہوئی چنگاریاں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ: يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ... (۲/۳۰) یہ زمین پر فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔

چنانچہ اس اولین دور کے بعد، انسانیت کی ساری تاریخ (بجز چند لمحات کے) خون ریزیوں اور فساد انگیزیوں کا عبرتناک مرقع اور جگر خراش داستان ہے۔ جس میں ایک فرد دوسرے فرد کے، ایک خاندان دوسرے خاندان کے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے، اور ایک قوم دوسری قوم کے سامنے، خنجر بدست (اور اس کے ساتھ ہی کفن بدوش) کھڑی ہے۔ اور یہ سب کا ہے کے لئے؟ ——— اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (۱۶/۹۲) تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے زیادہ سلب و نہب ——— (EXPLOITATION) کر سکے اور اس طرح اس پر بالادست ہو جائے۔ قوموں کی اس باہمی مسابقت سے انسانیت کس جہنم سے گذر رہی ہے، اس کے متعلق ابھی ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ مفاد پرستیاں اُبھریں کیسے؟

زمین، ذریعہ پیداوار ہے، لیکن زمین کی کیفیت یہ ہے کہ ——— وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ ۔ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۔ (۱۵/۲۱) ——— اس میں رزق کے خزانے مدفون ہیں، لیکن وہ خزانے ایک خاص انداز سے اور پیمانے کے مطابق ہی باہر آتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، زمین سے رزق حاصل کرنے کے لئے محنت درکار ہوتی ہے اور یہ رزق اس محنت کے تناسب سے حاصل ہوتا ہے ——— جتنی زیادہ محنت، اتنا ہی زیادہ حصولِ رزق۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کی مشترکہ مفاد کی زندگی کی جگہ، انفرادی مفاد اندوزی نے لی تھی تو اس میں سب سے زیادہ خوشحال اُسے ہونا چاہیئے تھا جو سب سے زیادہ محنت کرے۔ لیکن ابلیس، یعنی انسان کی عقلِ فریب کار نے، جو اس کے جذبات کی تسکین کے لئے اسباب و ذرائع تجویز کرتی اور اس کے ہر اقدام کے لئے وجوہِ جواز (JUSTIFICATORY -- REASONS) تراشتی ہے، اس کے کان میں پھر افسوں پھونکا، اور اس سے کہا کہ میں تمہیں ایسی تدبیر بتاتی ہوں جس سے محنت دوسرے کریں اور تم آرام سے بیٹھے سامانِ زیست سمیٹتے جاؤ۔

فتنے کی بنیاد

اس کے لئے اس نے ذرائع رزق پر ملکیت کا تصور دیا۔ اس تصور سے ہوس پرست انسان کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ اس نے مختلف حیلہ جوئیوں اور فریب انگیزیوں سے زمین پر لکیریں کھینچیں، اور ایک حصہ زمین کو اپنی ملکیت قرار دیکر دوسروں کو اس سے محروم کر دیا۔ جب ان محرومین کی ذریعہ رزق تک رسائی نہ رہی، تو وہ مجبور ہو گئے کہ وہ "مالکانِ اراضی" کی مرضی کے مطابق محنت کریں اور ان کی دی ہوئی روٹی کھائیں۔ اس سے دنیا میں بیگار، یعنی غلامی کی لعنت کی بنیاد پڑی۔ اگر ایسا ہوتا کہ یہ محنت کش غلام، جس قدر کھاتے، اس سے کم (یا اتنا ہی) پیدا کرتے تو یہ نظام زندہ نہ رہ سکتا۔ لیکن جتنا انہیں دیا جاتا تھا وہ اس سے زیادہ کما کر دیتے تھے۔ اس سے اس نظام کو استحکام حاصل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دن نوعِ انسان کی تاریخ میں سب سے زیادہ منحوس تھا جب ایک غلام نے اپنے مالک کو اس سے زیادہ کما کر دیا جتنا وہ کھاتا تھا۔ اس سے اس ابلیسی

نظام کو استواری نصیب ہوئی جس میں محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ نوعِ انسان کی، خاندانوں، قبیلوں اور قوموں کی تقسیم، تمدنی اور سیاسی نوعیت کی تھی۔ لیکن اگر آپ بنظرِ تعمق دیکھیں، تو یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آجائے گی کہ بنیادی طور پر انسان، دو ہی طبقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ ایک طبقہ محنت کرنے والا، اور دوسرا طبقہ ان کی محنت کی کمائی پر پُر آسائش زندگی بسر کرنے والا۔ اس طبقہ کو قرآن، مترفین کہہ کر پکارتا، اور نوعِ انسان کا بدترین دشمن قرار دیتا ہے۔

دو گروہ

آپ تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالئے، اسلوب و انداز مختلف ہوں گے، اسباب و ذرائع متباین ہوں گے، نقاب اور پیکر بھی متنوع ہوں گے۔ لیکن نوعِ انسان اصولی اور بنیادی طور پر انہی دو گروہوں میں منقسم دکھائی دے گی ــــــ ایک گروہ محنت کشوں کا۔ دوسرا گروہ ان کی محنت کے ماحصل کو غصب کرنے والوں کا ــــــ اس نظامِ معیشت و تمدن کی رُو سے، اصول یہ طے پایا کہ محنت کش کو صرف اتنا دیا جائے جس سے وہ محنت کر سکے، کما کر دینے کے قابل رہے۔ اس سے زائد اس کے پاس کچھ نہ پہنچنے پائے۔ اور غاصبین کے پاس ان کی ضروریات سے فاضل دولت ــــــ (SURPLUS MONEY) جمع ہوتی رہے۔ یہ فاضلہ دولت، تمام فسادات کی جڑ ہے۔ اسی سے یہ طبقہ اقتدار حاصل کرتا ہے، اور اس اقتدار کی رُو سے، محنت کشوں کو ان کی پست سطح پر رہنے پر مجبور کئے رکھتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ تاریخِ انسانیت میں زمامِ اقتدار کبھی محنت کشوں کے ہاتھ میں نہیں آنے پائی۔ یہ ہمیشہ غاصبین کے قبضہ میں رہی ہے۔ اس زمانہ میں جسے عصرِ حاضرہ جہالت اور بربریت کا دور کہتا ہے، یہ اقتدار خالص طبیعی قوت (PHYSICAL FORCE) کے بل بوتے پر قائم رکھا جاتا تھا، دورِ تہذیب میں اس قوت کو قانون کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ جو قانون، غاصبینِ محنت

قانون بھی انہی کا آلۂ کار ہے

کا وضع اور نافذ کردہ ہوگا، وہ کس کے مفاد کا تحفظ کرے گا؟ یہ قانون، چوروں، قزاقوں، رہزنوں کو مجرم قرار دے گا۔ (تاکہ ان غاصبین کی دولت محفوظ رہے۔ مزدور کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جسے کوئی چرا کر لے جائے گا؟) لیکن یہ قانون ان لوگوں کو کبھی مجرم قرار نہیں دے گا، جو دوسروں کی کمائی کو دن رات لوٹتے رہتے ہیں۔ یہ جرائم کے انسداد کے لئے تدابیر اختیار کرے گا۔ لیکن جرائم کے محرکات اور اسباب و علل کو ختم کرنے کے لئے کچھ نہیں کرے گا ــــــ اس کے لئے کہ یہ محرکات و اسباب تو خود اس قانون ساز سرمایہ دار طبقہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں ــــــ اس نکتہ کی وضاحت اسلامی تاریخ کے اس واقعہ سے ہو سکے گی کہ ایک شخص کے ملازموں نے کسی کے

کھیت سے غلہ چرا کر کھایا تو حضرت عمرؓ نے انہیں سزا دینے کے بجائے، ان کے آقا کو سزا دی، کیونکہ وہ انہیں پیٹ بھر کر کھانے کے لئے نہیں دیتا تھا اور انہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر غلہ چرا کر کھایا تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ ان کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ مبنی تھا قرآن کے اس اصول پر کہ اضطراری حالت میں، بھوک مٹانے کی حد تک، حرام کھانے کی بھی اجازت ہے۔ یہ تھا محرکاتِ جرائم کے انسداد کی طرف مؤثر اقدام ——— مستقل احتیاج۔ پیہم احساسِ عدمِ تحفظ (SENSE OF INSECURITY) طبقاتی تفاوت کے پیدا کردہ امتیازات سے معاشرہ کے خلاف جذباتِ انتقام و نفرت، قدم قدم پر مجروح ہونے والی انسانی خودی کا تخلیق کردہ احساسِ کمتری۔ اپنی مرضی اور اختیار کے بغیر غریبوں کے گھر میں جنم لینے کے گناہ، بلکہ یوں سمجھئے کہ دنیا میں آجانے کے جرم کی پاداش میں عمر بھر سزا بھگتنے کے احساس سے نظامِ عدل و انصاف کے خلاف جذباتِ بغاوت، احترامِ آدمیت کی تمام راہیں بند ہو جانے سے، خود زندگی سے بیزاری ——— یہ اور اسی قسم کے اور اسباب ہیں جو جرائم کے محرکات بنتے ہیں۔ دوسروں کی محنت کو غصب کرنے والا طبقہ، ان محرکات کو روکنے کی تدبیر کس طرح کرے گا اور کیوں کرے گا؟ ایسا کرنے کے لئے انہیں سب سے پہلے اس نظام کو ختم کرنا ہوگا جس میں محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا حاصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے انہیں خود اپنے بامِ بلند سے نیچے اتر کر سطحِ آدمیت پر آنا پڑے گا۔ اس کے لئے انہیں خود کما کر کھانا پڑے گا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اپنی کمائی میں سے ان لوگوں کے لئے بھی دینا پڑے گا جو کسی وجہ سے کمانے کے قابل نہ رہیں۔ یہ لوگ ایسا کیوں کریں گے؟ ان کی تو انتہائی کوشش یہی رہے گی کہ اس نظام کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں جس میں محنت کش کو سر اٹھا کر چلنے کی جرأت ہی نہ ہو۔ لہٰذا ان لوگوں کے وضع کردہ قانون کی رو سے وحدت و مساواتِ انسانیہ کیسے پیدا ہو سکے گی؟ اور اس قسم کے قانون کے مطابق فیصلوں کو میزانِ انسانیت میں عدل کیسے قرار دیا جا سکے گا؟

لیکن ظاہر ہے کہ خالی دھاندلی اور دھونس سے، اپنے ہی جیسے انسانوں کے اس قدر گروہِ کثیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی گرفت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے لئے کچھ اور حربوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پہلے "دانشوروں" کا گروہ آگے بڑھتا ہے اور عقلی دلائل سے ان زیردستوں کو مطمئن کرانے کی کوشش کرتا ہے

فلسفہ کے دلائل

کہ ان کے لئے وہی مقام مناسب اور عین مطابقِ فطرت ہے جس پر انہیں رکھا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور یونانی مفکر ارسطو کے ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز میں ستر دلیلیں دیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ٹیڑھے پاؤں کے لئے ٹیڑھا جوتا ہی مناسب ہوتا ہے۔ اگر آپ اسے سیدھا جوتا پہنا دیں گے تو اس

سے وہ دو قدم بھی نہیں چل سکے گا۔ یہ کیا ہے؟ عقلِ فریب کار کی حیلہ تراشیاں جس سے وہ محض ایک غلط مثال (یا تشبیہہ) سے پیدا کردہ تصورِ زندگی کو مستقل قدر بنا کر دکھائی دیتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مختلف صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اس لئے معاشرہ میں ان کا مقام، ان کی صلاحیتوں کے مطابق متعین ہونا چاہیئے۔ اگر کم صلاحیت والے کو اونچا مقام دے دیا گیا تو وہ ٹیڑھے پاؤں کو سیدھا جوتا پہنا دینے کے مرادف ہوگا۔ یعنی ان غاصبین کا معاشرہ پہلے ایسا انتظام کرتا ہے جس سے زیردست طبقہ کی صلاحیتیں ابھرنے ہی نہ پائیں۔ اور اس کے بعد، اس اختلافِ صلاحیت کو طبقاتی تقسیم کے لئے بطور دلیل پیش کر دیتا ہے۔ علم و حکمت کے ان اجارہ داروں سے کوئی پوچھے کہ اگر پیدائشی صلاحیتیں عمر بھر اپنی سطح پر جامد رہتی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ زیدؓ اور ان کے بیٹے اسامہ (رض) اور ان جیسے صدہا اور غلام، مزدور، محنت کش، جنہیں اس زمانہ کے معاشرہ نے ہر قسم کی صلاحیتوں سے عاری اور ذلیل ترین مخلوق قرار دے رکھا تھا، چند دنوں کی صحیح تعلیم و تربیت سے کس طرح انسانی صلاحیتوں کے بلند ترین مظہر بن گئے تھے؟ اگر فطرت، غلام کو پیدا ہی خدمت گذاری کے لئے کرتی ہے تو دنیا میں غلاموں نے سلطنتیں کس طرح قائم کر دکھائی تھیں؟

پھر یہی حکمتِ ابلیسی ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ مختلف قسم کے کام کرنے والوں کی ضروریات بھی مختلف ہوتی ہیں اس لئے ہر ایک کو یکساں نہیں ملنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی بنیادی ضروریات اس کی طبیعی زندگی کے تقاضے پورے کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک انجینئر کی طبیعی زندگی کے تقاضے، ایک مزدور کی زندگی سے مختلف ہوتے ہیں جو ان کے لئے سامانِ پرورش میں تفاوت بھی ناگزیر ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ہر فرد کے ذمے جو کام لگایا جائے گا، اس کام کے سرانجام دینے کے لئے مختلف آلات و ادوات کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ ان کی طبیعی ضروریات میں بھی فرق ہوگا۔ اگر ایک مزدور کو چائے کے ساتھ انڈے اور مکھن دے دیئے جائیں تو کیا ان سے اس کے پیٹ میں درد اٹھنے لگ جائے گا؟ اور اگر اس کے گھر میں بھی صوفہ سیٹ رکھ دیا جائے تو کیا اسے اس پر بیٹھنے سے سوئیاں چبھیں گی؟ قرآن کریم نے جنت کے متعلق کہیں یہ نہیں کہا کہ اس میں کچھ لوگوں کو کھانے کو گوشت، پھل، دودھ، شہد، بیٹھنے کو صوفے اور قالین، اور پہننے کو حریر و اطلس ملیں گے اور دوسرے لوگوں کو دال روٹی دی جائیگی، جسے وہ پھوس کی جھونپڑی میں زمین پر بیٹھ کر کھائیں گے۔ وہاں اس قسم کی کوئی تفریق نہیں بتائی گئی۔ یہ جہنمی معاشرہ کا اسلوب و انداز ہے جس میں انسان اور انسان کی طبیعی ضروریات میں اس قدر تفاوت روا رکھا جاتا ہے۔ اور کام کی اجرت، اس تفاوت کے

پیشِ نظر متعین کی جاتی ہے۔ اسے (LIVING WAGE) کہا جاتا ہے۔

اجرتوں کا تعین

یہ اجرتوں کا تعین بھی، عزیزانِ من! عجیب گورکھ دھندا ہے۔ مزدور کی اجرت تین روپے روز ہوگی اور انجینئر کی تیس روپے یومیہ۔ سوال یہ ہے کہ اس تین روپے اور تیس روپے یومیہ اجرت مقرر کرنے کا معیار اور اصول کیا ہے؟ یہ معیار طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا سوال ہے۔ اور کیا؟ کارخانہ دار کو ایک ہزار مزدور اور ایک انجینئر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ طبقہ انتظام ایسا کرتا ہے کہ ملک کی کثیر آبادی مزدوروں کے سوا کچھ اور نہ بن سکے۔ لہٰذا، اس جنس کی رسد (SUPPLY) طلب (DEMAND) سے زیادہ ہوتی ہے۔ بنا بریں مزدور کے لئے اس بات کے فیصلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جو اجرت اسے پیش کی جاتی ہے وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ وہ اس قدر ضرورت مند ہوتا ہے کہ اسے جو اجرت بھی میسر آجائے، اسے غنیمت سمجھتا اور آجر کا شکر گزار ہوتا ہے کہ اس نے اسے رزق مہیا کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ بڑی بڑی صنعتوں والے، ملک کے سر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اس قدر کثیر آبادی کے لئے رزق فراہم کرنے کا انتظام کرتے ہیں۔ یہ ہیں عقلِ فسوں ساز کے وہ حیلے جن سے وہ نوعِ انسان کی اس تقسیم و تفریق کی جڑیں مضبوط کئے رکھتی ہے۔

اسی عقلِ فسوں ساز نے انسان کو ایک اور مغالطہ بھی دے رکھا ہے اور یہ وہ مغالطہ ہے جسے آغازِ تاریخ سے اس وقت تک، مشرق و مغرب میں ہر جگہ، ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ وہ مغالطہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ ذاتی ملکیت اور زیادہ سے زیادہ انفرادی نفع اندوزی کے سوا کوئی جذبہ محرک نہیں جو اسے زیادہ سے زیادہ کام پر آمادہ کر سکے۔ میں اپنے موضوع سے دُور نکل جاؤں گا اگر اس نکتہ پر تفصیلی بحث کروں کہ انسان کی سرے سے کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت تو مجبور اشیاء کی ہوتی ہے ——— جیسے آگ کی فطرت حرارت پہنچانا ہے ——— اور انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ کی فطرت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتا اور اپنے لئے آپ راہیں تراشتا ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح تصور کر لیا جائے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جس کام میں اسے ذاتی نفع نہ ہو، وہ اس کے لئے کوشش نہیں کرتا، تو آپ ایک حقیقت پر غور کیجئے۔ ہم تاریخِ انسانیت میں ان افراد کی تعریف کرتے ہیں، ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں، ان کے مجسمے نصب کرتے ہیں، انہیں نوعِ انسان کا محسن قرار دیتے ہیں، جنہوں نے اپنے نفع کی خاطر نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر عمریں صرف کر دیں، بلکہ جانیں تک دے دیں! ——— سوال یہ ہے کہ یہ لوگ، جو تاریخِ انسانیت کے ممتاز ترین مقام پر فائز ہیں، کیا یہ سب خلافِ فطرت زندگی بسر کرتے تھے؟

اگر انسان کی فطرت کوئی چیز ہے (جسے فطرت نہیں بلکہ شرفِ انسانیت کہنا چاہیئے) تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنی ذات کے لئے نہیں، عالمگیر انسانیت کے لئے جیئے۔ صرف اپنے اور اپنی اولاد کے لئے جینا، حیوانی سطح زندگی ہے۔ دوسروں کے لئے جینے والا، انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ حیوان صرف اپنے لئے جیتا ہے، انسان دوسروں کے لئے بھی جیتا ہے۔

بہر حال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ دوسرے انسانوں پر اپنی گرفت محکم رکھنے کے لئے انسانی عقل نے عجیب و غریب دلائل تراشے ہیں اور زیردست طبقہ کو قسم قسم کے حربوں سے اپنے دامِ تزویر میں پھنسائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن، عزیزانِ من! عقل کی گرفت انسان کے دماغ پر ہوتی ہے، دل پر نہیں۔ اور دماغ پر گرفت کے ڈھیلا پڑ جانے کا ہر وقت خطرہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسانیت کش نظام، تنہا عقل کے زور پر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اس کے لئے انسانی جذبات کو اپنے قابو میں رکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ خدمت "مذہب" سرانجام دیتا ہے۔ (یاد رکھیئے! میری مراد خدا کی طرف سے عطا کردہ دین سے نہیں، انسانوں کے خودساختہ مذہب سے ہے۔)

اربابِ مذہب کی فریب دہی

مذہب، کبھی اس زیردست طبقہ کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کرتا ہے کہ ہر انسان کی پیدائش اس کے سابقہ جنم کے اعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ اس اصول کے مطابق، برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوتا ہے۔ کھشتری اس کے بازوؤں سے، ویش اس کے پیٹ کی اور شودر اس کے پاؤں کی تخلیق ہوتا ہے۔ یہ تقسیم خود برہما کی قائم کردہ ہے جس میں کوئی انسان ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ اس تقسیم کے خلاف حرفِ شکایت لب تک لانا تو ایک طرف، دل میں شکوہ سنج ہونا بھی انسان کو مہا پاپی بنا دیتا ہے۔ اس لئے انسان کو اپنے مقام پر صابر و شاکر رہنا چاہیئے۔ کبھی وہ اس مظلوم و مقہور طبقہ کو اس فریب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ دنیا اور اس کی آسائشیں وہ دلدل ہیں جس میں پھنس کر انسانی روح کبھی خدا سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تمام لذائذ و حظائظ قابلِ نفرت ہیں۔ دولت مند لوگ اس دنیا کی چند روزہ زندگی آسائشوں میں گذار لیں۔ اس کے بعد، یہ جہنم کی آگ میں جھلسائے جائیں گے اور آسمان کی بادشاہت غریبوں کے حصے میں آئے گی۔ کبھی وہ انہیں اس عقیدہ میں مگن رکھتے ہیں کہ امیری اور غریبی، عزت اور ذلت، پستی اور بلندی، رزق کی تنگی اور فراوانی، سب خدا نے اپنے ہاتھ میں لکھی ہے اور اسے ہر شخص کی پیدائش سے پہلے مقدر کر دیا جاتا ہے۔ مقدر کا بدل دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسان کو ہمیشہ راضی بہ رضا رہنا چاہیئے۔ رضائے مولیٰ بر ہمہ اولیٰ۔ اس لئے تقدیر کے خلاف کسی کے لب پر حرفِ شکایت نہیں آنا چاہیئے۔ آپ غور کیجئے تو تقدیر کا عقیدہ، ہندوؤں کے ورنوں کے

عقیدہ سے بھی زیادہ غیر منطقی ہے۔ دونوں کا عقیدہ خود ساختہ ہی سہی، لیکن اس کے لئے ایک منطقی دلیل تو دی جاتی ہے۔ یعنی اس میں شودروں سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم جو اس پستی کی حالت میں پیدا کئے گئے ہو، تو یہ ایشور کی دھاندلی نہیں۔ تم نے پچھلے جنم میں کرم ہی ایسے کئے تھے جن کے نتیجہ میں تم شودر پیدا ہوئے ہو۔ لیکن تقدیر کے لئے اتنی سی دلیل بھی نہیں دی جاتی، نہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے، وہ جسے جس حالت میں چاہے رکھے۔ غریبی اور امیری، رزق کی بست و کشاد، پستی اور بلندی، سب اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے (معاذ اللہ) نہ کوئی قاعدہ ہے، نہ قانون۔ یہ یکسر اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس کے فیصلوں کے خلاف لب کشائی کرنا انسان کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔ یعنی اس میں انسانی سوچ اور فکر کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہنے دی جاتی ـــــ یہ ہیں سکّے کے دو جانب جن میں مذہبی پیشوائیت، غریب انسانوں کو پھنسائے رکھتی ہے۔

وہ یہ کرتے ہیں اور سرمایہ دار طبقہ ان کے لئے جاگیریں مقرر کرتا اور جائیدادیں وقف کر دیتا ہے۔ چنانچہ، محنت کرکے نہ یہ کھاتے ہیں اور نہ ہی ان کا سرپرست طبقہ ـــــ! جھونپڑیوں میں بسنے والا محنت کش اپنا خون پسینہ ایک کرکے ان سب کے محلات کی رنگینیوں کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہی کی محنت کی کمائی سے سرمایہ دار کے پاس فاضلہ دولت کے انبار لگ جاتے ہیں، اور مذہب کا مقدس اجارہ دار آگے بڑھ کر یہ فتوےٰ دے دیتا ہے کہ تم گھبراؤ نہیں۔ جس قدر جی چاہے دولت اکٹھی کر لو اور جائیدادیں کھڑی کرتے جاؤ، تمہیں ایسا کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ وہ اس قسم کے فتوؤں سے بالادست طبقہ کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ دولت خدا کی دین ہے۔ وہ جس قدر جی چاہے سمیٹتے چلے جائیں۔ گویا دولت آسمان سے اولوں کی طرح برستی ہے جسے بچے جھولیاں بھر بھر کر سمیٹ سکتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ دولت، محنت سے پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک روپیہ جسے مترفین کا طبقہ بلا محنت اپنی تجوری میں ڈالتا ہے، مزدور کے سینکڑوں قطرات خون کا منجمد فشردہ ہوتا ہے۔ کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ یہ لوگ جانوروں کے خون کو تو حرام سمجھتے ہیں، لیکن انسانوں کے خون کو شیرِ مادر کی طرح حلال و طیب قرار دیتے ہیں۔

یہاں تک میں نے، برادرانِ عزیز! تقسیم آدم کے اس حصے سے بحث کی ہے جو ایک قوم کے اندر وجہ فساد آدمیت بنتا ہے۔ اب ہم قوم کی حدود سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر آتے ہیں۔ اس سطح پر اجمالی طور پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ جو کچھ بالادست طبقہ، زیر دست طبقہ کے ساتھ ایک معاشرہ کے اندر کرتا ہے، وہی کچھ ایک بالادست

اقوامِ غالب کی حیثیت

قوم، زبردست، قوموں کے ساتھ کرتی ہے۔ ہمارے زمانے ہیں، بالادست قومیں صنعت میں ترقی یافتہ ہوتی ہیں، اس لئے انہیں ایک طرف ایسی قوموں کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں خام مال سپلائی کریں اور دوسری طرف ان منڈیوں کی جہاں ان کا تیار کردہ مال فروخت ہو۔ اس مقصد کے لئے ان اقوام نے شروع میں، ان پسماندہ اقوام پر اپنا سیاسی تسلط براہِ راست قائم کیا اور ان کے گھروں میں پہنچ کر چھاؤنیاں ڈال دیں۔ یہ دورِ استعماریت (COLONISATION) کا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے، ان پسماندہ اقوام کی عادات اس قدر بگاڑ دیں کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ان اقوامِ غالب کی تیار کردہ مصنوعات کی محتاج ہو گئیں ـــ تہذیب کی فریب کارانہ زبان میں یوں کہا جانے لگا کہ انہوں نے ان کا "معیارِ زیست بلند کر دیا" ـــ دوسری طرف انہیں اس قدر اپاہج بنا دیا کہ وہ اب، وہ کچھ بھی اپنے ہاں تیار نہ کر سکیں جو کچھ وہ اس سے پہلے اپنے ہاتھوں سے تیار کر لیا کرتی تھیں۔ ان قوموں کو اس حالت تک پہنچا کر وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلی گئیں، اور میکیاولی سیاست کی زبان میں کہا گیا ـــ کہ انہوں نے آزادی عطا کر دی ہے اور یہ، ان اقوام ہی پر نہیں، عالمِ انسانیت پر ان کا احسانِ عظیم ہے۔ چونکہ ان میں کوئی قوم برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ان کی منڈیوں میں کوئی دوسری قوم دخیل ہو سکے، اس لئے انہوں نے ان منڈیوں کے اردگرد اپنے فوجی اڈے مستحکم کر لئے اور زیردست اقوام سے کہا کہ اس سے اُن کی حفاظت مقصود ہے۔ اس کے بعد، ان اقوامِ غالب نے، پسماندہ اقوام کو مزید "مہذب" بنانے کے لئے، ان کے ہاں اپنی بڑی بڑی مشینیں نصب کر دیں۔ یہ مشینیں دی تو گئیں قرض پر لیکن تعبیر کیا گیا اسے "امداد" سے۔ ان مشینوں میں جو کچھ تیار ہوتا ہے، انکے کیمیاوی اجزاء (CHEMICALS) سب اُنہی اقوامِ غالب کے ہاں سے منگوانے پڑتے ہیں۔ نیز، اگر ان مشینوں کا ایک پیچ بھی ٹوٹ جائے تو جب تک وہ ان کے سرچشمہ مالک سے نہ آئے، مشین بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس پروگرام کی رُو سے ان اقوام کو سمجھایا گیا کہ وہ صنعتی ترقی کر رہی ہیں۔

پھر ان اقوامِ غالب نے بساطِ سیاست پر ایسے مہرے رکھے کہ یہ پست اقوام اپنی ہمسایہ اقوام سے ہمیشہ خائف رہیں اور اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے اسلحہ کی محتاج رہیں۔ یہ اسلحہ انہی اقوامِ غالب کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ یہ قومیں ان پسماندہ اقوام کو، بلا لحاظ اس امر کے کہ ان میں سے کس کی ضرورت جائز ہے، اس طرح اسلحہ فراہم کرتی ہیں کہ ان میں سے کبھی ایک کا پلڑا جھک جائے، کبھی دوسری کا اور اس طرح ان میں قوت کا عدم توازن جاری رہے۔ اس طرح ان اقوام کی آمدنی کا بیشتر حصہ، اسلحہ کی خرید کی نذر ہو جاتا ہے اور انہیں روٹی تک بھی مانگ کر کھانی پڑتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان قوموں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر

فسادِ آدمیت کے لئے یہی حربے کچھ کم نہ تھے کہ انسانوں میں بُعد و منافرت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے، عقلِ انسانی کی دسیسہ کاری نے، سکّہ (CURRENCY) کو بھی اپنا آلۂ کار بنایا۔ زمانہ قدیم میں زندگی کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بارٹر

سکّہ کی دسیسہ کاریاں

سسٹم (تبادلۂ اشیاء) کا رواج تھا۔ میرے پاس گندم ضرورت سے زائد ہے، آپ کے پاس نمک۔ میں نے آپ کو گندم دے دی اور اپنی ضرورت کے لئے نمک لے لی۔ اس سے ایک تو ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں اور دوسرے، دولت کسی ایک جگہ جمع نہیں ہونے پاتی تھی ——— نالنو جنس کا زیادہ ڈھیر جمع کر کے انسان کیا کرتا اور اسے کب تک محفوظ رکھ سکتا! جب آبادیاں وسیع ہوئیں تو انسان نے تبادلۂ اشیاء کی سہولت کی غرض سے سکّہ ایجاد کیا۔ یہ بڑی مفید ایجاد تھی، لیکن جس طرح انسان کی ہوس پرستی نے دوسری مفید ایجادات کے غلط استعمال سے ان کی افادیت کو تباہی سے بدل دیا، یہی کچھ سکّے کے ساتھ ہوا۔ اس سے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے، دولت کا بے حد و حساب اکتناز شروع ہو گیا اور جہاں تک اقوام کا تعلق ہے، غالب اقوام نے تبادلۂ زر کے عیارانہ اُلٹ پھیر سے سکّوں کی قیمتوں میں کچھ اس طرح کا تفاوت رکھا کہ پسماندہ اقوام کا روپیہ وہاں پہنچ کر چار آنہ رہ جائے۔ جہاں تک انسان اور انسان میں بُعد و منافرت کا تعلق ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ لندن کے بھرے بازار میں کھڑے ہوں اور ایک ہزار پاکستانی روپیہ آپ کی جیب میں ہو لیکن آپ وہاں سے ایک آنہ کی روٹی خرید کر نہیں کھا سکتے۔ وہاں آپ بھی اجنبی ہیں، آپ کی کرنسی بھی اجنبی۔ کچھ سمجھے آپ؟ آپ انسانوں کی بھری بستی میں، تنہا ہیں۔ آپ خود اپنی جنس کے اندر کھڑے غیر ہیں، بیگانہ ہیں، اجنبی ہیں۔ آپ اس زمین کے رہنے والے نہیں، کسی آسمانی کرّے سے ٹپک پڑے ہیں۔ اور اس زمین کے رہنے والوں سے آپ کا کوئی رشتہ ناطہ، کوئی تعلق واسطہ، کوئی رابطہ ضابطہ نہیں۔ رنگ، نسل، وطن، زبان کا فرق تو پہلے ہی تھا۔ اب اس سکّے نے اس فہرست میں ایک اور کا اضافہ کر دیا ——— اور سخت اضافہ ——— کس قدر صحیح نقشہ کھینچا تھا اس ابلیسی معاشرہ کا قرآن نے جب کہا تھا کہ اس میں انسان کی کیفیت یہ ہو گی کہ:۔

يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰/۱۵)

وہ دوسرے انسانوں کے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپکو تنہا پائے گا۔

یہ ہے عزیزانِ من! وہ مقام، جس پر انسانیت اس وقت کھڑی ہے۔ اس سے یہ کرۂ ارض انسانوں کی بستی نہیں رہا، ایک مذبح بن چکا ہے جس میں جسدِ انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر

بکھرا پڑا ہے۔ اور وہی نوعِ انسان جو کبھی ایک برادری تھی، اس کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ (۳۶-۳۴/۸۰)

بھائی بھائی سے الگ ہے، بیٹا ماں باپ سے جدا، میاں بیوی سے اور بیوی میاں سے بیگانہ۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ (۸۰/۳۷)

ہر ایک اپنی اپنی بپتا میں اس طرح مبتلا کہ ایک کو دوسرے کا ہوش تک نہیں ۔ ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
قیامت ہے کہ انساں، نوعِ انساں کا شکاری ہے

اقوامِ عالم کی باہمی آویزش

قومیتوں کی اس تفریق سے پیدا شدہ نفسا نفسی اور افراتفری سے انسان کی حالت کیا ہو چکی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود ان اقوام سے پوچھئے جو ابھی کل تک نیشنلزم کو خدا کی رحمت قرار دیا کرتی تھیں۔ سنئے کہ اب انہی اقوام کے مفکرین اس عفریت کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہیں۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر، الفریڈ کوبن، اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے:۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پہ پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار، اپنی قومی وحدت کی تکمیل پہ ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے، تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے حقِ خود مختاری مانگتی ہوں۔ (صفحہ ۱۶۶)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD) میں لکھتا ہے:۔

> ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم، نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

ہمارے زمانے میں نیشنلزم کی حیثیت ایک سیاسی نظریہ ہی کی نہیں رہی۔ اس نے ایک مذہبی عقیدہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں:۔

> نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست

مذہب فلاح اور وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔ (THE PERENNIAL PHILOSOPHY)

اس نیشنلزم نے انسان اور انسان میں کس حد تک مخاصمت پیدا کر رکھی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس وقت امریکہ کا شمار دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ پسماندہ ممالک کے لئے اس کی "امداد" نے (جس کی نقاب کشائی میں ابھی ابھی کر چکا ہوں) ساری دنیا میں اس کے جذبۂ ہمدردیٔ نوعِ انسان کی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ لیکن یہ اس امریکہ کی بات ہے جو اس خطۂ زمین کے شمال میں واقع ہے۔ اسی امریکہ سے ایک قدم کے فاصلے پر جنوبی امریکہ ہے۔ اس کی حالت کیا ہے، اس کا اندازہ ان چند اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ جنہیں (FELIX GREEN) نے اپنی کتاب (A CURTAIN OF IGNORANCE) میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

> لاطینی امریکہ کی بیس کروڑ آبادی کا دسواں حصہ بھی ایسا نہیں ہوگا جسے پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو۔ ریو ڈی جنیرو، بیونس آئرس اور میکسیکو جیسے چند شہروں کو چھوڑ کر باقی علاقہ کی حالت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے، غلاظت کے ڈھیروں پر پڑے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کے ماں باپ بیس سینٹ روزانہ کی اجرت پر دن بھر محنت و مشقت کرتے ہیں۔

خود اس ملک کے اندر طبقاتی تفریق کا یہ عالم ہے کہ ملک کی کل آمدنی کا آدھا حصہ چلی کی آبادی کے دسویں حصہ کی تجوریوں میں چلا جاتا ہے اور نصف آمدنی باقی نوّے فیصد آبادی کے حصہ میں آتی ہے۔ فلپائن کی یہ حالت ہے کہ وہاں کی آبادی کے قریب ۸۶ فیصد حصہ کو بمشکل ایک وقت کا کھانا نصیب ہوتا ہے اور وہاں کے بچوں کی بیس سے چالیس فیصد تعداد، ایک سال کے اندر اندر مر جاتی ہے۔ یہ ہے اس امریکہ کے ہمسایہ ممالک کی حالت جس کی کشادہ ظرفی اور بنی نوعِ انسان کے لئے جذبۂ غمگساری کا ڈھنڈورا اس شد و مد سے پیٹا جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا، عزیزانِ من! کہ وہ جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اگر تم نے اشتراکِ باہمی کی زندگی کو چھوڑا تو تم ایک دوسرے کے دشمن بن جاؤ گے اور تم میں (WEDGES) حائل ہو جائیں گی۔ وہ کیسی بنیادی حقیقت تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس سے حالت یہ ہو گئی ہے کہ:-

> زیرِ گردوں آدم، آدم را خورد ملّتے بر ملّتے دیگر چرد

انسان کی اپنی حالت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک قوائے فطرت کی تسخیر کا تعلق ہے، دنیا جس مقام پر گذشتہ پچاس سال میں پہنچ گئی ہے اس سے

؎۱ یہ خطاب سنہ ۱۹۶۷ء میں لکھا گیا تھا۔

پہلے کہ چھ ہزار سال کی مجموعی ترقی اس کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ لیکن علم و ہنر کی اس قدر ثریا بوس رفعت اور حدود فراموش وسعت کے باوجود، انسانوں کی اس عظیم بستی کی کیا حالت ہے جسے زمین کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ماہرِ علم النفس، ڈاکٹر ینگ (JUNG)، کا ایک فقرہ دہرا دینا کافی ہوگا جو اس نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں لکھا تھا۔ اس نے کہا تھا:

آج کرۂ ارض کی عظیم شاہراہوں پہ پریشے ویرانی، اداسی، اور فرسودہ نظر آتی ہے۔

یہ بات اس نے سنہ ۱۹۳۱ء میں کہی تھی۔ اگر ینگ آج زندہ ہوتا تو ان شاہراہوں کی موجودہ ویرانیوں کو دیکھ کر معلوم کیا کہتا۔ وہی کچھ کہتا جو چند سال اُدھر، امریکہ کے دو صحافیوں نے اپنے ملک کی تمدنی اور معاشرتی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا اور جو کچھ انہوں نے کہا تھا، وہ انکی کتاب کا ٹائیٹل پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ کتاب تھی اہلِ امریکہ کے متعلق اور اس کا ٹائیٹل تھا۔

(THE LONELY CROWD)

برادرانِ عزیز! کیا انسانی معاشرہ کی اس سے زیادہ عبرت انگیز تصویر کوئی اور بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسا ہجوم ہے جس میں ہر فرد اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اور پھر انسان کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن اس جہنم سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ :-

عشق ناپید و خرد می گزدشش صورت مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس وقت دنیا کا حساس طبقہ اپنی موجودہ حالت کی وجہ سے سخت مضطرب و بے قرار ہے۔ وہ ہزار جان سے چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ دنیا ایک اور دنیا میں بدل جائے۔ اس دنیا کا کس قسم کا نقشہ اس کے ذہن (یا یوں سمجھیے کہ ان کے خوابوں) میں آتا ہے، اس کے متعلق

انسان کس قسم کی دنیا چاہتا ہے؟

خود انہی کے الفاظ میں سنئے۔ کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری۔ (TEILHARD-DE-HARDIN) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب "تعمیرِ ارض" (BUILDING THE EARTH) میں لکھتا ہے:

اب اقوام کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کریں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے اچھال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے

اور وہ ہے وحدت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر، پوری نوعِ انسان کو اپنے آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب (THE COMMUNITY OF MAN) میں لکھتا ہے کہ:-

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہمدگر جوڑ دے۔ انسانی ارتقا کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

مشہور امریکی مفکر (LEWIS MUMFORD) لکھتا ہے کہ "تہذیب درحقیقت اس عمل پیہم اور غیر مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا اور ایک انسانی برادری کی تشکیل کرے"۔ وہ آگے چل کر کہتا ہے:

اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التوا میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مغربی اندازِ معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور یہ تمدن بڑی طرح ناکام ثابت ہوا ہے...... اب دنیا کو ایک ایسے بطلِ جلیل کی ضرورت ہے جو اس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جنہوں نے انسان کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح اسکی نشو و نما کے راستے میں بڑی طرح حائل ہو رہی ہیں ـــــ اس بطلِ جلیل کی ضرورت جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانے سے نکال کر، وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے۔

(TRANSFORMATION OF MAN)

جولین ہکسلے کہتا ہے کہ دنیا کی موجودہ مختلف حکومتوں کی جگہ ایک عالمگیر واحد حکومت کا قیام، نوعِ انسان کو تباہی سے بچا سکتا ہے[1] کہ اس عالمگیر وحدتِ انسانیہ اور وحدتِ نظامِ حکومت کے تحت جو نئی دنیا وجود میں آئے گی وہ کس قسم کی ہوگی، اس کا نقشہ سویڈن کا ماہر معاشیات (GUNNER MYRDAL) ان الفاظ میں کھینچتا ہے:-

یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان، ہر مقام پر، خود اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے کام اور اندازِ زیست کا انتخاب کرے گا۔ اور اس میں معاوضہ اس محنت کا ملے گا جس سے کچھ تخلیق ہو، اور یہ معاوضہ نسل اور کلچر کی تمیز کے بغیر سب کے لئے یکساں ہوگا۔
یہ وہ دنیا ہوگی جس میں سرمایہ اور محنت، انسانی ضرورتوں کے مطابق اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل ہوتا رہے گا۔ اور اس میں دنیا کے تمام ممالک اور تمام

---

[1] (ON LIVING IN A REVOLUTION)

افراد کو ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ جب تک دنیا کی یہ حالت رہے گی کہ اس کی نصف آبادی دولت مند اور باقی نصف مفلس ہے، کوئی عالمگیر معاشی نظام وجود میں نہیں آ سکے گا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ صاحب سویڈن کے ماہر معاشیات ہیں۔ اور سویڈن وہ ملک ہے جہاں کی فلاحی مملکت، دنیا میں سب سے آگے سمجھی جاتی ہے۔ اس فلاحی مملکت کے ماہر معاشیات نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے (BEYOND THE WELFARE STATE) یعنی اس ماہر معاشیات کے نزدیک، فلاحی مملکت بھی نوعِ انسان کے اس بنیادی مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حل، اس سے کہیں آگے جا کر ملے گا۔ آگے چل کر یہ مصنف لکھتا ہے:

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آ جائے جس میں نہ کرۂ ارض کے نقشے پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں، اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہو گی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہو گی۔ اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

"انسانی روح کے مذہبی نشیمن" میں اس قسم کی حسین دنیا کا تصور تو اب عام طور پر کیا جانے لگا ہے، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ حسین خواب مخصوص تعبیر کا پیکر کس طرح اختیار کرے۔ جہاں تک مختلف مذاہب کا تعلق ہے، دنیا ان سے مایوس ہو چکی ہے۔ کس حد تک مایوس، اس کے متعلق پروفیسر (WILLIAM ERNST HOCKING) اپنی کتاب (LIVING RELIGIONS AND A WORLD FAITH) میں لکھتا ہے:

یہ تمام مذاہب ٹوٹی پھوٹی کشتیاں ہیں جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ (اطمینانِ خویش نے درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے۔) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر نہیں آ سکتی) ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان کے (افکار و عمل کے) قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں کے تصور سے اس قدر ڈرے اور سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

مذہب کیسا ہو؟

دنیا کا انسان ان مذاہب سے مایوس ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی مشکلات کے حل کے لئے دروازہ پھر مذہب ہی کا کھٹکھٹاتا ہے لیکن کس قسم کے مذہب کا؟ لارڈ مارلے کے الفاظ ہیں، اس مذہب کا جس کی دعوت تمام نوعِ انسان کے لئے ہو۔ (ERICH FROMM) کا خیال ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:-

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔

(THE SANE SOCIETY)

ممفورڈ کا خیال ہے کہ اس قسم کا مذہب (حضرت) عیسیٰؑ اور (حضرت) محمدؐ جیسی شخصیتیں دے سکتی ہیں۔ وہ شخصیتیں کہ زمانے کا بحران ان کی تخلیقی نگاہ کو ایک عظیم انقلاب سے ہم آہنگ کر دے اور وہ اس قابل ہوں کہ نوعِ انسان کی صفوں میں ایک عالمگیر انقلاب برپا کر سکیں۔

(THE TRANSFORMATION OF MAN)

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ عصرِ حاضر کا خود گزیدہ انسان، اپنے دکھوں کے مداوا کے لئے کس مقام پر پہنچا ہے اور اس کی نگاہِ تجسس اسے کس چشمۂ زندگی کا سراغ دے رہی ہے۔ نوعِ انسان کی موجودہ مرگ آفریں زندگی کو حیاتِ جاوید میں بدلنے والا انقلاب، یقیناً (حضرت) عیسیٰؑ اور (حضرت) محمدؐ جیسی ہستیاں ہی برپا کر سکتی ہیں۔ لیکن دنیا میں اس وقت نہ تو خود (حضرت) عیسیٰؑ موجود ہیں اور نہ ہی (حضرت) محمدؐ۔ اس لئے انسان کو لامحالہ ان کے دیئے ہوئے پیغام ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کا تعلق ہے، ان کا لایا ہوا پیغام اس وقت اپنی اصلی شکل میں دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ اور جس پیغام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس سے انسان پہلے ہی مایوس ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق (مثلاً) جرمن ہیومنسٹ فلاسفر (GERHARD SZCZESNY) لکھتا ہے:-

عیسائیت صحرا نوردوں کا مذہب بن سکتی ہے۔ بنیادی طور پر اس کا پیغام ثنویت (DUALISM) کی تعلیم دیتا ہے۔ جو فلسفہ اور سائنس کا ساتھ دے ہی نہیں سکتی۔ دو ہزار سال سے اس نے علم اور سائنس کی گاڑی کو بریک لگا رکھے ہے۔

(THE FUTURE OF UNBELIEF)

پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:۔

> عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں، بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقی دنیا بعد کی دنیا ہے۔ اس کے برعکس یہ دنیا شر اور فساد کی دنیا ہے۔ اس میں کوئی شے بالکل خیر اور طیب نہیں۔[1]

مشہور مفکر پروفیسر وائٹ ہیڈ لکھتا ہے:۔

> انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اگر اسے موجودہ زمانے میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔[2]

اس تجزیہ کے بعد ہمارے سامنے عزیزانِ من! صرف (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا لایا ہوا پیغام رہ جاتا ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حرفاً حرفاً اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ جس وحدتِ انسانیت کے لئے اس وقت دنیا کے مفکرین اس قدر مضطرب و بے قرار ہیں اور انسانی معاشرہ کا جو نقشہ وہ اپنے خوابوں میں دیکھ رہے ہیں، نبی اکرمؐ کا لایا ہوا پیغام، ان کی ان حسین آرزوؤں کو پورا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے یا نہیں۔ اور اگر اس کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کے حصول و قیام کے لئے کوئی ممکن العمل پروگرام بھی دیتا ہے یا یونہی نظری تصورات ہی پیش کر دیتا ہے۔ یہ مقام خاص توجہ کا مستحق ہے۔ میں اس سلسلہ میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پیغام کو میں اس لئے پیش نہیں کر رہا کہ میں خود اس کی صداقت اور محکمیت کا قائل ہوں۔ میں اسے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ (جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا) حالات کے تجزیہ نے ہمیں خود اس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں ہمیں اس پیغام پر غور و فکر کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ یہ میری پیشکش نہیں۔ دنیا کے مفکرین کا بیتابانہ مطالبہ ہے جسے پورا کرنے کے لئے میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ اسے بے کم و کاست، اور بلا تبصرہ و تقریظ ان کے سامنے پیش کر دوں اور یہ فیصلہ ان پر چھوڑ دوں کہ اس پیغام میں دنیا کی مشکلات کا حل موجود ہے یا نہیں۔ وما توفیقی الّا باللّٰہ العلی العظیم

قرآن کا پیش کردہ نظام

قرآن کریم نے قصۂ آدم کے سلسلہ میں جہاں کہا تھا کہ تم نے جو انفرادی مفاد پرستی کی زندگی اختیار کی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں پھوٹ پڑ جائے گی اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہو جاؤ گے۔ تو اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا انسان کی یہ حالت ابدی ہوگی؟ ——— کیا وہ اس نفسا نفسی کی قیامت خیزی

1۔ GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

2۔ (ADVENTURE OF IDEAS)

اور تشتت و انتشار کے جہنم سے کبھی نہیں نکل سکے گا؟ عیسائیت نے ہبوطِ آدم (FALL) سے یہی عقیدہ وضع کیا تھا کہ انسان اس پستی سے اپنی سعی و کاوش سے نکل ہی نہیں سکے گا۔ وہ ابدی طور پر راندۂ درگاہ ہو گیا۔ لیکن قرآن نے کہا کہ نہیں۔ ایسا نہیں ——— ابدی مایوسی شرفِ انسانیت کے منافی ہے۔ انسان پھر سے اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پا سکتا ہے۔ اس کے لئے خود خدا اس کی مدد کرے گا۔ اور وہ اس طرح کہ اسے اس کی طرف سے راہنمائی ملے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2/38) جو کوئی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا تو اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ یہ راہنمائی رسولوں کے ذریعے بھیجی گئی۔ رسولوں کی بعثت سے مقصد کیا تھا، غور سے سنیئے کہ۔ قرآن کریم اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ——— كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ (2/213) چونکہ مقصود یہ تھا کہ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری بن کر رہے اس لئے خدا نے انبیاء کو مبعوث کیا۔ وہ لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر انہوں نے انفرادی مفاد پرستی کی روش کو نہ چھوڑا تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ اور اگر وہ ایک برادری کی حیثیت سے رہے، تو وہ خوشگواریوں کے جھولے جھولیں گے۔ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ط... اور ان کے ساتھ ضوابطِ کتاب بھی بھیجے جاتے رہے تاکہ اُن کی رو سے، اُن امور کے حق و انصاف کے ساتھ فیصلے کئے جا سکیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں اور جن کی وجہ سے اُن میں گروہ بندیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تمام انبیاء کرامؑ کی دعوت یہی تھی اور یہ سب کا مقصود و منتہیٰ بھی۔ لیکن عہدِ قدیم میں چونکہ وسائلِ رسل و رسائل اور سامانِ مواصلات بہت محدود ہوتے تھے اس لئے ان حضرات کی دعوت ان کے علاقوں کے اندر محدود ہو کر رہ جاتی تھی اور تمام نوعِ انسان کو امت واحدہ بنانے کا پروگرام عالمگیر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے حیطۂ اثر کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کو، خاندان، قبیلہ، نسل کے امتیازات سے بلند کر کے، خالص انسانیت کی بنیادوں پر ایک مشترک برادری کی تشکیل کرتے تھے جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیتے وہ ایک برادری کے افراد بن جاتے تھے۔ جو اس کی مخالفت کر کے، طبقاتی تفریق کی گرہوں کو مستحکم رکھنا چاہتے تھے وہ فریقِ مخالف قرار پاتے تھے۔ یہی بنیادی طور پر کفر اور اسلام کا امتیاز تھا۔ قرآن کریم، اس فریقِ مخالف کو مترفین یعنی سرمایہ داروں کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے جن کی تائید و حمایت مذہبی اجارہ داروں کی طرف سے ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، سرمایہ دارانِ قوم اور مذہبی پیشواؤں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فرعون، ہامان اور قارون ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ——— آسمانی رشد و ہدایت کی ساری تاریخ انہی دو گروہوں کے باہمی تصادم و تزاحم کی داستان ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تا آنکہ جب انسانیت کے سنِ بلوغ کو پہنچنے کا زمانہ آگیا تو خدا کی طرف سے آخری نبی آیا۔ اور اپنے ساتھ وہ ضابطۂ ہدایت لایا جس میں اس مقصد کے حصول کا مکمل پروگرام

دیا گیا تھا۔ اس رسولؐ نے آکر اعلان کیا کہ: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸)۔ اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغامبر ہوں۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس خطاب میں کسطرح انسانوں کی خودساختہ حدود و ثغور سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ کچھ اپنے متعلق کہا اور اپنے پیغام کے متعلق اعلان کیا کہ: ــــــ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷) اے ساری دنیا میں بسنے والے انسانو! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ ہدایت آگیا ہے جو تمہارے نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہوسِ زرپرستی ایک نفسیاتی مرض ہے، اسی لئے قرآن کو اس مرض کیلئے نسخۂ شفا کہا گیا ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر کہا: ــــــ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ (۱۰/۱۰۸) اے نوعِ انسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، تمہارے پاس الحق (THE TRUTH) آگیا۔ اب تمہیں انسانوں کے خودساختہ فریب انگیز نظاموں کی پیروی چھوڑ دینی چاہیئے۔ عالمگیر انسانیت کے نام اس رسولؐ کا پیغام یہ تھا کہ:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۱-۲۲) اے نسلِ انسانی! تمہیں چاہیئے کہ تم قوانینِ خداوندی کی محکومی اختیار کرو۔ اس خدا کے قوانین کی جس نے تمہیں اور تمہارے آباؤاجداد کو پیدا کیا اور کائنات کی اس قدر تسخیری قوتوں کے علی الرغم نسلِ انسانی کو مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے اس مقام تک لے آیا۔ بس یہی طریق ہے جس سے تم راستے کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔

یہ حفاظت تمہیں، خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی رُو سے مل سکے گی جس کے مطابق اس نے تمہارے لئے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا۔ اُوپر فضا میں کُرّے بکھیر دیئے۔ پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلامزدومعاوضہ ملا ہے۔ اس پر ملکیت خدا ہی کی ہے۔ تمہیں صرف اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا، تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ، جانتے بوجھتے، خدا کے ساتھ اور خدا کھڑا کر دینے کے مرادف ہوگا۔

اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کہا:-

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۫ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ… اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۶۸ (۲/۱۶۸)

اے نوعِ انسان! تم رزق کے سرچشموں کو تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھو اور اس میں سے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق نہایت خوشگوار طریق سے کھاؤ پیو۔ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کر کے، انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے نہ لگ جاؤ۔ وہ تمہارا دوست نہیں، دشمن ہے۔

آپ نے عزیزانِ من! اس آیۂ جلیلہ کے الفاظ پر غور فرمایا؟ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ جو کچھ زمین سے حاصل ہو، اگر وہ تمام نوعِ انسان کے لئے سامانِ زیست بنتا ہے تو اسے رزقِ حلال و طیب کہا جائے گا۔ اور اگر اس کی یہ شکل نہیں رہے گی تو پھر یہ شیطانی رزق ہو جائے گا۔ اس پیغام کے دینے والے خدا نے، قرآنِ کریم کی سب سے پہلی آیت میں اپنا تعارف رب العالمین کہہ کر کرایا (1/1) یعنی کسی خاص قوم، نسل، گروہ، خاندان، قبیلہ کا نشوونما دینے والا نہیں، بلکہ عالمگیر انسانیت کو نشوونما دینے والا۔ اس ابتدائی تعارف کے بعد، سارا قرآنِ کریم خدا کی اسی ربوبیتِ عالمینی اور انسانیت ساز تعلیم کی تشریح ہے۔ اس نے خود قرآن کو ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ کہا ہے۔ (12/104) اور اس کے لانے والے رسول کو رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ۔ (21/107)

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی تعلیم کس طرح انسانوں کی خود ساختہ گروہ بندیوں کی زنجیروں کو توڑ کر، عالمگیر انسانیت کو اپنے آغوشِ عاطفت میں لاتی ہے، اور ان انسانوں کو، جنہیں مفاد پرستیوں کی ہوسِ خون آشامی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، پھر سے ایک عالمگیر برادری میں منسلک کرنے کی طرف عملی دعوت دیتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ عدالتِ خداوندی میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جن کی روش یہ ہے کہ ـــــ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ (2/27) جنہیں ملانے کا خدا نے حکم دیا تھا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں، اور یوں انسانوں کی اس بستی کو فساد انگیزیوں کی رزم گاہ بنا دیتے ہیں۔ یہ لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے لئے زندگی کی آسائشیں سمیٹ لیتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ اللَّعۡنَۃُ وَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ (13/25) یہ لوگ اپنے آپ کو زندگی کی حقیقی سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم کرتے ہیں۔ انجام کار ان کا ٹھکانہ بہت برا ہوگا۔ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یاد رکھو! وہی نظریۂ حیات، وہی نظامِ زندگی، وہی عمل اپنے اندر باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو خاندان، قبیلہ، گروہ، نسل، قوم، وطن، کی حدود سے آگے بڑھ کر تمام نوعِ انسان کیلئے نفع بخش ہوگا۔

ـــــ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13/17)

وحدتِ انسانیت

قرآنِ کریم، عزیزانِ من! خالی وعظ نہیں کہتا۔ نہ ہی خدا کا رسول محض ایک ڈاکیہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کا پیغام پہنچا کر چلا جاتا ہے۔ قرآن جس نصب العین کو پیش کرتا ہے اس کے حصول کا عملی پروگرام بھی دیتا ہے۔ اور اس کا رسول، اس پروگرام پر عمل کر کے بتاتا اور دکھا دیتا ہے کہ یہ پروگرام

نہ تو ناممکن العمل ہے اور نہ ہی اپنی کامیابی کے لئے کسی مافوق الفطرت ایجنسی کا محتاج۔ انسانوں کیلئے یہ پروگرام ہے۔ اور انسانوں کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس پروگرام کو بروئے کار لانے والے قدم قدم پر اعلان کرتا جاتا ہے کہ: اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک جماعت کی تشکیل کرتا ہے جس کی خصوصیات یہ بتاتا ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اس جماعت کو نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے متشکل کیا جا رہا ہے۔ یہ جماعت عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اس میں رنگ، نسل، قومیت، وطن کی تمیز و تفریق کے بغیر، ہر وہ انسان شامل ہوسکتا ہے جو وحدتِ خالق کے ایمان کی بناء پر وحدتِ خلق کے مسلک کا پیرو ہونا چاہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وحدتِ انسانیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، انفرادی مفاد پرستی کا سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اس لئے اس نظام کو مٹا کر، اس کی جگہ عالمگیر نظامِ ربوبیت کا نفاذ اس جماعت کا فریضہ قرار پاتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، جہاں کہا ہے کہ ——— وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ۔ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُوْنَ۔ وَزُخْرُفًا ط وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط
وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۴۳/۳۳-۳۵) اگر یہ مقصودِ فطرت یہ نہ ہوتا کہ تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنتا ہے تو ہم ان لوگوں کو جو ہمارے نظامِ ربوبیت عالمینی سے انکار کر کے سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لینا چاہتے ہیں، ایسا بے لگام چھوڑ دیتے کہ وہ اتنی دولت جمع کر لیتے جس سے ان کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں تک چاندی کی ہو جاتیں اور ان کے گھروں کے دروازے اور کرسیاں سونے کی لیکن طبقات میں اس تفاوت سے نوعِ انسان ایک برادری نہ بن سکتی۔ اس لئے ہم ایسی جماعتیں پیدا کرتے رہتے ہیں جو دولت کی اس غلط تقسیم کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور اس حقیقت کو عام کرتی ہیں کہ انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصود صرف اسی زندگی کی آسائش و آرائش نہیں، اس کی مستقبل کی زندگی کی فلاح و بہبود بھی ہے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے تابع رہے۔ نظامِ سرمایہ داری کے تحت یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس سے واضح ہے کہ نوعِ انسان کی عالمگیر وحدت کے لئے نظامِ ربوبیت کا قیام لاینفک ہے، لیکن یہ نظام متشکل نہیں ہوسکتا جب تک ذرائعِ رزق اس نظام کے کنٹرول میں نہ ہوں۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے اس جماعت کی اپنی آزاد مملکت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں قوانین سازی کا اختیار کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو نہیں ہوتا۔ لہٰذا، اس میں اس کا امکان نہیں ہوتا کہ کوئی گروہ اپنی مفاد پرستی کے لئے، اپنی مرضی سے قانون بنا لے ——— ان قوانین کے اصول محدود،

خدا کے مقرر کردہ اور غیر متبدل ہوتے ہیں جن کا اطلاق تمام انسانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یہی اصول، غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے معیار مطلق (ABSOLUTE STANDARD) ہوتے ہیں۔

ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ مفکرینِ عالم، وحدتِ انسانیت کے لئے وحدتِ حکومت کا قیام، بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے واحد حکومت کس طرح عمل میں آسکتی ہے۔ اس کا طریق قرآن بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وحدتِ حکومت کے لئے وحدتِ قانون ناگزیر شرط ہے۔ یعنی ایسے ضابطۂ قوانین کا وجود جس کا اطلاق تمام نوعِ انسان پر یکساں ہو۔ اس قسم کا ضابطہ، انسانوں کا وضع کردہ ہو نہیں سکتا۔ انسان جو قانون بھی مرتب کرے گا، اس میں اس کے رجحاناتِ قلبی اور میلاناتِ ذہنی کی آمیزش ضرور ہوگی۔ اس قسم کی رنگ آمیزی سے بالاصرف خدا کا وضع کردہ ضابطۂ قوانین ہوسکتا ہے جو انسانی جذبات و عواطف سے بالا ہے۔ اور تمام نوعِ انسان کی نشوونما جس کے پیشِ نظر ہے۔ یہ نظام وحدتِ قانون کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے اور مختلف اقوام و ممالک کی خودساختہ لکیروں کو مٹاتا ہوا ایک عالمگیر اُمت کی تشکیل کئے جاتا ہے۔ وہ اصول و اقدار جن کی بنیادوں پر یہ نظام استوار ہوتا ہے، ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں۔ لیکن ہر زمانے کے انسانوں کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنی ضروریات کے مطابق جزئی قوانین خود وضع کریں۔ اس سے نہ تو انسان ایسا سرکش اور بدلگام ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے من مانے قوانین بنا بنا کر دوسروں کو اپنا محکوم بناتا چلا جائے اور نہ ہی ایسا پابہ زنجیر کہ زمانہ کہیں سے کہیں چلا جائے اور وہ قدامت پرستی اور تقلید کے بندھنوں میں جکڑا رہے۔ یہ اصول و قوانین عقل و فکر کے تقاضوں کی تسکین کرتے ہیں اور انہیں علم و بصیرت کی رُو سے پیش کیا جاتا ہے۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا اس اُمت کا اولین فریضہ ہوتا ہے لیکن وہ تسخیرِ فطرت، تخریبِ آدم کے لئے نہیں کرتی، انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے کرتی ہے۔ احترامِ آدمیت اس کا مطمحِ نگاہ ہوتا ہے اور "آدم" میں چونکہ مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں، اس لئے اس نظام میں، جنس (SEX) کی بنا پر انسان اور انسان میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اس میں مرد اور عورت دوش بدوش آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی انسان، نہ دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے، نہ محکوم ——— اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس!

یہ نظام، نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے متعلق مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کرے گا۔ ان میں مرکزی حیثیت اس اجتماع کو ہوگی جسے حج سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کعبہ جس کا مرکز ہے۔ کعبہ اور حج کے متعلق قرآن کا پیش کردہ تصور بڑا غور طلب ہے۔

کعبہ اور حج کی حیثیت

کعبہ، اینٹ اور پتھر کی اس عمارت کا نام نہیں جو مکہ میں ایستادہ ہے۔ جس طرح آج ہم (مثلاً) جب "ماسکو" کہتے ہیں تو اس سے ایک خاص شہر مراد نہیں ہوتا بلکہ یہ لفظ نمائندگی کرتا ہے اس نظام کی جو روس میں نافذ ہے۔ اسی طرح کعبہ، درحقیقت ترجمانی کرتا ہے، اس نظام کی جو نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ دیکھئے، قرآن کریم، اس نکتہ کی وضاحت کیسے دلنشیں الفاظ سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایسے مراکز تو موجود تھے جو کسی خاص قوم، خاص قبیلہ یا خاص مذہب سے نسبت رکھتے تھے، لیکن ایسا کوئی مرکز نہیں تھا جسے خالص انسانیت کا مرکز کہا جا سکے۔ اس قسم کا مرکز کعبہ کو بنایا گیا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا۔ (۳/۹۶) یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں پہلا گھر، جسے انسان کا گھر کہا جا سکے، مکہ میں بنایا گیا جو بڑا ہی بابرکت ہے۔ اس گھر کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (۳/۹۷) جو بھی اس میں داخل ہو گیا ـــــ یعنی اس نظام کے سایۂ حفاظت میں آ گیا جس کا مرکز وہ گھر ہے وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ و مامون ہو گیا۔ لہٰذا، کعبہ نوعِ انسانی کی پناہ گاہ ہے۔ وہ دنیا بھر کے ستائے ہوئے انسان کے لئے امن کا نشیمن ہے۔ دوسری جگہ ہے: وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا۔ (۲/۱۲۵) اس گھر کو اس لئے بنایا گیا کہ تمام انسان، اپنے اختلافات ختم کر کے، ایک مرکز پر جمع ہو سکیں۔ اور اس طرح آلام روزگار سے امن و سلامتی حاصل کر لیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ۔ (۵/۹۷) کعبہ کو واجب الاحترام مرکز اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس نظام کی رو سے جس کا یہ مرکز ہے، عالمگیر انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے۔ اسی لئے اسے "شہر آزاد" (OPEN CITY) قرار دیا گیا ہے۔ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ۔ (۲۲/۲۵) اسے وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے یکساں کھلا رکھا گیا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ مکہ کے مکانات کرایہ پر نہیں دیئے جا سکتے۔ اس مرکزی مقام میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں شرکت کی دعوت تمام نوعِ انسان کے لئے عام ہے۔ چنانچہ معمارِ حرم، حضرت ابراہیمؑ جب تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے تو ان سے کہا گیا کہ، وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ (۲۲/۲۷) تمام نوعِ انسان کو حج کے لئے پکار کر دعوت دے دو۔ اور انسانوں سے کہا گیا کہ ـــــ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا (۳/۹۷) ـــــ جو بھی وہاں تک پہنچنے کی راہ پائیں وہ اس اجتماع میں شریک ہوں۔ لیکن وہ اس اجتماع میں شرکت اس لئے نہ کریں کہ وہاں جا کر کمزور قوموں پر ظلم و زیادتی کی سکیمیں سوچی جائیں گی، یا لوگوں سے قوانینِ خداوندی کے بجائے انسانوں کے خودساختہ قوانین کی اطاعت کرائی جائے گی۔ جن لوگوں کی یہ ذہنیت اور نیت ہوگی، وہ ان اجتماعات میں شریک نہیں ہو سکیں گے

شریک ہونا تو ایک طرف، انہیں تو اس کے پاس تک پھٹکنے نہیں دیا جائے گا۔ (۹/۲۸) عالمگیر انسانیت کو ان اجتماعات میں شرکت کی دعوت اس لئے دی جائے گی کہ: لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (۲۲/۲۸) تاکہ وہ وہاں جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام، ان کے فائدے کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

حق و باطل کی کشمکش

یہ ہے عزیزانِ من! وہ نظام جسے قرآن، وحدتِ انسانیت کے لئے تجویز کرتا ہے۔ اس نظام کو وہ حق کا نظام کہتا ہے، اور اس کے برعکس ہر وہ نظام جو انسانیت میں تفریق کا موجب بنتا ہے، اس کے نزدیک باطل کا نظام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کا ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ٹکراؤ کمیونزم کے فلسفۂ تاریخ کا ٹکراؤ نہیں جس میں کبھی ایک نظام غالب آجاتا ہے اور کبھی اس کے برعکس دوسرا نظام۔ حق و باطل کے ٹکراؤ میں، حق آہستہ آہستہ باطل پر غالب آتا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے تو حق کی علمبردار بن کر رزم گاہِ حیات میں باطل کے مقابل کھڑی ہو جاتی ہے، تو حق کا غلبہ دنوں کے اندر ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ حق کائناتی قوتوں کی رُو سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسے ہماری اصطلاح میں زمانے کے تقاضے کہتے ہیں۔ لیکن اس طرح حق کے غالب آنے کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، خدا کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب انسان، وحی کی راہنمائی میں جادہ پیما ہوتا ہے تو اس کا سفرِ حیات دنوں میں طے ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کا اتباع نہیں کرتا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی ایک راستہ اختیار کرتا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ راستہ غلط ہے۔ پھر وہ دوسری راہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح وہ عقل کے تجرباتی طریق ——— (TRIAL AND ERROR) سے، مختلف راستوں کی ٹھوکریں کھاتا، ایک عرصۂ دراز کے بعد، صحیح منزل پر پہنچتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کی جماعت کے ساتھ، وحی کی روشنی میں اس راستہ کو اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظام، چند دنوں میں قائم ہو گیا۔ اور ایک دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح دیکھتے دیکھتے، مختلف ملکوں، نسلوں قوموں کے افراد ایک ایسی برادری کے رشتے میں منسلک ہو گئے جس میں تفریق و تقسیم کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، مفاد پرست قوتوں نے پھر سر ابھارا اور اس نظام کی جگہ پھر اسی نظامِ کہن نے لے لی جس میں انسان اور انسان میں بُعد و منافرت پیدا ہو گئی ——— خود مسلمانوں کے اندر مذہبی فرقوں کی تفریق، جسے قرآن نے بہ نصِ صریح شرک

قرار دیا تھا۔ نسلوں کی تفریق، ذات پات کی تفریق، امیر و غریب کی تفریق، ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق، حاکم اور محکوم کی تفریق، آجر اور مستاجر کی تفریق، بندہ اور آقا کی تفریق۔ اور یہی نظام مسلمانوں میں آج تک چلا آ رہا ہے۔ یاد رکھئے۔ یہ نظام غیر قرآنی ہے۔ اسے اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں —— یہ مذہب ہے، دین نہیں۔

لیکن اگر یہ نظام مسلمانوں کے ہاں باقی نہیں رہا تو اس سے عالم انسانیت کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نظام کے اصول اور اسے متشکل کرنے کا پروگرام قرآن کے اندر موجود اور محفوظ ہے اور جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقوق کسی خاص قوم کے حق میں محفوظ نہیں، اسی طرح قرآن پر بھی کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں۔ یہ ذکرٌ للعالمین ہے، بصائرُ للناس ہے۔

جس کا جی چاہے اسے اپنا لے

یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے کھلا ہوا صحیفہ ہے۔ جس کا جی چاہے اسے اپنا لے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ اس وقت، مسلمانوں کے مقابلہ میں۔ مغربی ممالک کی غیر مسلم اقوام میں اسے اپنانے کے رجحانات زیادہ ہیں۔ مسلمان اپنے مروجہ نظام کو جو صدیوں سے پیہم چلا آ رہا ہے، حق کا نظام سمجھ کر ایک گہرے فریب میں مبتلا ہے —— جس قوم پر بھی مذہبی پیشوائیت کا غلبہ ہوگا اس کی یہی حالت ہوگی —— لیکن اقوامِ مغرب اپنے ہاں کے مروجہ نظامہائے حیات سے بڑی طرح تنگ آ چکی ہیں۔ اور (جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں) وہ ایک ایسے نظام کی تلاش میں مضطرب و بیتاب نظر آتی ہیں جو وحدتِ انسانیت کا ضامن بن سکے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام، قرآن کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔ اس لئے خود زمانے کے تقاضے انسان کو اس طرف لا رہے ہیں۔ اس کی نشاندہی بھی خود قرآن ہی نے کر دی ہوئی ہے، جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا، وحدتِ انسانیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ دیکھئے۔ قرآن کریم اس آنے والے دور کی نشاندہی کرتا ہوا، اس ضمن میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۔ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ (۸۳/۱-۳)

یاد رکھو! تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس ذہنیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوسروں سے اپنے واجبات پورے پورے لئے جائیں۔ لیکن جب ان کے واجبات دینے کا وقت آئے تو ترازو میں ڈنڈی مار دی جائے۔ دوسروں سے کام پورا پورا لیا جائے لیکن اس کام کا معاوضہ کبھی پورا نہ دیا جائے۔ محنت کرنے والوں کو کم از کم دیا جائے اور خود زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے۔ چیزوں ہی کو نہیں، بلکہ خود انسانوں کو تولتے اور ماپتے وقت بھی یہی خیال غالب رہے اور کوشش کی جائے، کہ ان کی صلاحیتیں دبی، سمٹی، سکڑی اور بندھی رہ جائیں۔ انہیں اتنا ہی ابھرنے دیا جائے جتنی وہ سرمایہ داروں کے منافع کے لئے مفید ہوں۔ انہیں اس سے زیادہ آزادی دی ہی نہ جائے۔ اس کے بعد کہا

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ۔ (۸۳/۴) کیا ان لوگوں کو اس کا خیال نہیں آتا کہ یہ نظام ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ وہ وقت آئے گا جب انہیں انسانیت کے راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۸۳/۵-۶) یہ اس انقلابِ عظیم کے وقت ہوگا جب انسانیت خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس دور کی بہت سی نشانیاں قرآن میں مذکور ہیں، مثلاً کہا گیا ہے کہ: اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ (۸۱/۴) جب اونٹ جیسا مفید جانور، تیز رفتار ذرائع سفر کی ایجاد سے بے کار ہو کر رہ جائے گا۔ وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ۔ (۸۱/۵) جب پسماندہ اور وحشی اقوام میں بھی اجتماعی زندگی کا احساس بیدار ہو جائے گا۔ وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۸۱/۶) جب سمندر جہازوں اور کشتیوں سے معمور ہو جائیں گے۔ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ جب آبادیاں یہاں سے وہاں تک ملتی ہوئی چلی جائیں گی۔ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ۔ (۸۱/۱۰) جب کتابیں، مجلات، اخبارات بہت زیادہ پھیل جائیں گی۔ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ۔ (۸۱/۱۱) جب آسمانی کُرّوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے جائیں گے۔ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ۔ وَ اَلْقَتْ۔ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ۔ (۸۴/۳-۴) جب ذرائع رسل و رسائل کے عام ہو جانے سے زمین پھیل جائے گی اور اپنے معدنی ذخائر کو باہر نکال پھینکے گی اور اس طرح اندر سے خالی ہو جائے گی۔ یہ تو خارجی کائنات میں رونما ہونے والے انقلابات کی نشاندہی ہے ——— خود انسانی دنیا کے اندر بھی ایک عظیم انقلاب آئے گا۔ اور وہ یہ کہ ——— وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ۔ (۸۱/۸-۹) جب عورت، کہ جسے مردوں کے استبداد نے زندہ درگور کر رکھا ہے، انسانیت کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور وہاں یہ سوال پوچھا جائے گا کہ اسے بالآخر کس جرم کی پاداش میں مدفون رکھا گیا تھا۔ یعنی اس دور میں صرف زمین کے مدفون خزانے ہی اُبھر کر باہر نہیں آئیں گے، انسانوں کے ہاتھوں کی دفن کردہ مظلوم عورت بھی دوبارہ زندہ ہو کر سطحِ انسانیت پر آ جائے گی۔ یہ ہے وہ دور جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسانیت، خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اور نظامِ سرمایہ داری الٹ جائے گا۔

کمیونزم کے ذریعے نہیں

لیکن یہ کچھ کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رُو سے نہیں ہوگا۔ جس میں انسان کے لئے وہ جذبۂ محرکہ نہیں ہوتا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور کم از کم اپنے لئے رکھ کر، باقی دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے برضا و رغبت دے دے، نہ ہی ان کے ہاں مستقل اقدار و مطلق معیارِ حق و باطل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نظام میں یہ کچھ (REGIMENTATION) کے ذریعہ کرنا پڑتا ہے جس سے فرد کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم جو نظام لاتا ہے اس میں اتنا ہی نہیں ہوتا کہ ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہتی ہیں، بلکہ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے۔ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا۔ (۸۲/۱۹) کسی فرد کا دوسرے فرد پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار نہیں ہوتا۔ اس میں ہر فرد کو مقامِ آدمیت نصیب ہوتا ہے اور وہ شرفِ انسانیت سے بہرہ یاب و سرفراز ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس نظام میں آئین و قوانین بھی

باقی نہیں رہتے۔ اور معاشرہ (کمیونزم کے فلسفہ کے مطابق) لا مملکتی اور لا قانونی ہوجاتا ہے۔ نہیں۔ اس میں لاقانونیت نہیں پھیلتی۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ: وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ۔ (72/18) اس میں تمام معاملات، خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اس میں اقتدارِ اعلیٰ ——— (SOVEREIGNTY) انسانوں کا نہیں، خدا کے غیر متبدل قوانین کا ہوتا ہے۔ اس میں مستقل اقدار اور مطلق معیارِ حق و باطل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یوں اس میں نہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہ ہوگا وہ دور جس کے متعلق کہا کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (14/48) اس وقت یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ (39/69) اور زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

آخری سہارا

یہ ہے وہ نظامِ ربوبیت، جو انسانیت کا آخری سہارا ہے اور جس سے، جنت سے نکلا ہوا آدم، پھر سے جنت کو پالے گا۔ قرآن کی رو سے انسان کا انجام تباہی نہیں، سرفرازی و سربلندی ہے۔ اس کے سفرِ حیات کا مآل، پستیوں کے عمیق غار نہیں، بلکہ: لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ (84/19) اس شہسوار کو بلند سے بلند تر مقامات کی طرف چڑھتے جانا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے منتظر ہیں تمام!
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

عصرِ حاضر کی بے پناہ تاریکیوں میں قرآن کا پیغام ہی وہ روشنی کا مینار ہے جو طوفانوں میں گھری ہوئی کشتیٔ انسانیت کو ساحلِ مراد کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ اقبالؒ کی آنکھ نے قرآنی بصیرت کی رو سے بہت پہلے دیکھ لیا تھا کہ ——— "جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم، اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے" ——— اقبالؒ نے اس نئی دنیا کا ایک دھندلا سا خاکہ دیکھا تھا لیکن اب زمانے کے تقاضوں سے وہ دھند آہستہ آہستہ چھٹ رہی ہے۔ اور وہ دنیا جسے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں تعمیر کر رہی تھی، اُفقِ کائنات سے اُبھر کر سامنے آرہی ہے ——— انسان کا موجودہ عالمگیر اضطراب، مایوسیوں کا پیغامِ مرگ نہیں، امیدوں کی نشید حیات ہے۔ یہ وہ خزاں ہے جو آنے والی بہار کے لئے طائرِ پیش رس ہوتی ہے۔ یہ وہ آخری شب کی تاریکی ہے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

دیکھنا یہ ہے کہ اس خورشیدِ جہانتاب کی پہلی کرن کی جبیں بوسی کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصے میں آتی ہے۔ جس کے نصیب میں یہ سعادت ہوگئی، اسی کی قسمت میں نوعِ انسان کی امامت، (لیڈرشپ) ہوگی۔

اور یہی ہے طلوعِ سحر کی وہ یقین آفریں امید جس کی وجہ سے، میں بھی یہ کہتے ہوئے اس پیکرِ محبوبیت کا دامن تھامے بیٹھا ہوں کہ ؎

تیرے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو!
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے در جاؤں

اقبالؒ کی دلی آرزو تھی کہ یہ سعادت اسی خطۂ زمین کو نصیب ہو۔ اسی کے لئے اس نے پاکستان کا تصور عطا کیا تھا —— اور اسی لئے میں بھی اس خطۂ ارض کی حفاظت اور سالمیت کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرستانہ ذہنیتیں اس کے راستے میں بڑی طرح روک بن کر کھڑی چلی آ رہی ہیں لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں۔ اور ایک فقیرِ بے نوا کی طرح اپنی اس صدا کو برابر دہرائے جا رہا ہوں کہ: ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

والسلام

بسلسلہ معذرت ص ۶ طلوعِ اسلام فروری ۱۹۸۵ء

قارئین و احباب طلوعِ اسلام کے لئے محترم پرویز صاحب کی بحالیٔ صحت کے بارے میں یہ اطلاع باعث طمانیت ہوگی کہ کامیاب (SURGICAL OPERATION) کے بعد انہیں جو جسمانی کمزوری رہ گئی تھی اس کے لئے —— (PHYSICO – THERAPY & MESSAGE TREATMENT) بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ احباب کی جانب سے مسلسل توجہ اور مزید استفسارات کا شکریہ، محترم پرویز صاحب کی طرف سے ابھی کچھ اور معذرت قبول فرمائیں

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

ادارہ طلوعِ اسلام کی

مطبوعات کی قیمتیں

(مارچ سنہ ۱۹۸۵ء)

نوٹ:- ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ کھلے پارے)	۱۵۰/- روپے	قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	روپے ۲۵/-
پارہ نمبر ۱، ۳۰ (فی پارہ)	" ۶/-	اسلام کیا ہے (تازہ ایڈیشن)	۵۰/-
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (")	" ۵/-	جوئے نور	۳۰/-
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ - مجلد)	" ۱۸۰/-	شعلۂ مستور	۴۰/-
(تین جلدوں میں) فی جلد	" ۶۰/-	جہانِ فردا	۴۰/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ - مجلد)	" ۲۲۵/-	معراجِ انسانیت (تازہ ایڈیشن)	۹۰/-
جلد اول تازہ ایڈیشن فی جلد	" ۷۵/-	شاہکارِ رسالت (تازہ ایڈیشن)	۷۵/-
بقیہ تین جلدیں - فی جلد	" ۵۰/-	انسان نے کیا سوچا؟	۷۵/-
تبویب القرآن تازہ ایڈیشن	" ۲۵۰/-	مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں	۱۵/-
مطالب الفرقان (جلد اول)	" ۷۵/-	حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۰/-
مطالب الفرقان (جلد دوم) (تازہ ایڈیشن)	" ۷۵/-	ابلیس و آدم (تازہ ایڈیشن)	۷۵/-
مطالب الفرقان (جلد سوم)	" ۷۵/-	(ISLAM A CHALLENGE	
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	" ۹۰/-	TO RELIGION	
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	" ۷۵/-	مجلد (H-B)	۷۵/-
تصوف کی حقیقت	" ۷۵/-	سلیم کے نام خطوط (جلد اول، دوم)	۶۰/-
نظام ربوبیت (جدید ایڈیشن)	" ۷۵/-	[illegible]	

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
طاہرہ کے نام خطوط	۱۰/- روپے	حسب ذیل کتب کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں	
مقامِ حدیث	۱۰/-	تازہ ایڈیشن چھپنے پر اعلان کیا جائے گا۔	
اسلامی معاشرت	۶/-	من و یزداں۔ برقِ طور۔ جہاد۔ سلسبیل۔ ختم نبوت اور	
قرآنی فیصلے (مکمل ۵ جلدیں)	۷۰/-	تحریکِ احمدیت۔ بہارِ نو۔ الفتنۃ الکبریٰ۔ کتاب التقدیر	
(پہلی تین جلدیں، ہر جلد -/۱۰ روپے)		فردوس گم گشتہ۔ عربی خود سیکھئے، پاکستان کا معمارِ اول	
(چوتھی جلد -/۲۰ روپے) جلد پنجم -/۲۰ روپے		اقبال اور قرآن۔ سلیم کے نام (جلد سوم)	
اسبابِ زوالِ اُمت	۵/-	**تصنیفات**:- (انگریزی) ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	
فجرالاسلام (مکمل دو جلدیں، فی جلد -/۸)	۱۶/-	PHENOMENA OF NATURE & QURAN (H-B)	روپے ۷۵/-
منزل بہ منزل	۱۵/-	CONSPIRACIES AGAINST QURAN (H-B)	۶۰/-
پرنسپل آف لا میکنگ اِن اسلام (انگریزی)	۵/-	FOOD AND HYGIENE IN ISLAM (P-B)	۸/-
قائداعظمؒ اور طلوعِ اسلام	۴/-	THE HEAVENS THE	۷۵/-
تاریخ الامت (مکمل سیٹ ۸ جلدیں)	۴۰/-	EARTH AND THE QURAN	

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ

اندرونِ ملک پاکستان = -/۴۸ روپے

غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک = -/۹۸ "

غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک

(i) خلیجی اور عرب ممالک (ایران، عراق، عرب امارات، کویت، سعودی عرب وغیرہ) = -/۱۲۸ روپے

(ii) انڈیا، برما، سری لنکا، جزائر مالدیپ وغیرہ = -/۱۳۳ روپے

(iii) افریقہ کے ممالک (لیبیا، کینیا، یوگنڈا، مصر، جنوبی افریقہ) = -/۱۴۳ روپے

(iv) یورپ کے ممالک (برطانیہ، فرانس، ناروے وغیرہ) = -/۱۴۸ روپے

(v) بنگلہ دیش، تھائی لینڈ، سنگاپور، ملائیشیا، جاپان وغیرہ -/۱۴۸ روپے

(vi) نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر فجی وغیرہ = -/۱۹۳ روپے

(vii) امریکہ، کینیڈا وغیرہ = -/۲۰۸ روپے

مذکورہ بالا چندہ میں خرچ ڈاک شامل ہے۔ البتہ جو خریدار پرچہ بذریعہ رجسٹری منگوانا چاہیں انہیں فیس رجسٹری (-/۳ روپے فی پرچہ) الگ ادا کرنا ہوگا۔

نوٹ:- ماہنامہ طلوعِ اسلام کے لئے صرف، ادارہ طلوعِ اسلام کو لکھئے۔

کتابیں منگوانے کا پتہ:- (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

معراجِ انسانیت

(تازہ ایڈیشن شائع ہو گیا)

سیرتِ صاحبِ قرآن۔ خود قرآن کے آئینے میں
حُسنِ سیرت کی رعنائیاں۔ خالقِ حسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اسکی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رُو سے
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب
- دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین

بارگاہِ رسالت مآبؐ میں

ایک انقلاب انگیز تصنیف، ایک عہد آفریں کوشش۔ عشق و خرد کا حسین امتزاج

بڑا سائز۔ ضخامت پانچسو صفحات۔ کاغذ نہایت اعلیٰ، جلد مضبوط، مزیّن اور مطلّا

قیمت فی جلد -/۹۰ روپے علاوہ محصول ڈاک

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

(پرویز صاحب کا نہایت بلیغ اور بصیرت افروز مقالہ جس کے پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہو چکے ہیں لیکن اب باقی نہیں رہے۔ احباب کے متعدد تقاضوں کے پیشِ نظر اسے شائع کیا جا رہا ہے۔)

آپ کسی سے بات کیجئے، اور زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کیجئے، حاصلِ گفتگو یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ گھر کے افراد میں کیریکٹر نہیں۔ پڑوسیوں میں کیریکٹر نہیں۔ اہلِ محلہ میں کیریکٹر نہیں۔ کاروباری دنیا میں کیریکٹر نہیں۔ دفاتر میں، عدالتوں میں، ایوانِ حکومت میں، اربابِ نظم ونسق میں، غرضیکہ کہیں بھی کیریکٹر نہیں ملتا۔ آپ کسی خرابی کا تجزیہ کریں۔ کسی شکایت کے بنیادی سبب کا سراغ لگائیں، آخرالامر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کیریکٹر کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ قوم کے زوال کا باعث ہے تو یہی مرض، اور پاکستان کی تباہی کا موجب ہے تو یہی علت۔ یہ روگ، قوم اور ملک کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قصرِ حیات کا ہر ستون کھوکھلا ہو چکا ہے، اور ہر قلبِ حساس اس خطرے سے متوحش ہے کہ کہیں ذرا سا بھی دھچکا لگا تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آگرے گی۔

کیریکٹر کے متعلق ہم گفتگو تو اسی شرح و بسط اور تکرار و اصرار سے کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں تو شاید سو میں سے ایک آدھ بمشکل بتا سکے کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے۔ جو کچھ عام طور پر کہا جائے گا وہ یہی ہوگا کہ جب تک کسی کو رشوت نہ دی جائے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنیں گے کہ صاحب! اس موجودہ افسر سے تو وہی افسر اچھا تھا جو دس روپے لے کر کام کر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تو دنیا تنگ آچکی ہے۔ جس کی مسل اس کے سامنے ہو اس کے متعلق یہ پہلے پتہ کرتا ہے کہ اس نے سابقہ الیکشن میں ووٹ کسے دیا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جس مقام پر کسی کے کام میں کوئی رکاوٹ پڑے یا اسے کوئی نقصان ہو، تو وہ کہہ دے گا کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کیریکٹر کی یہ تعریف (DEFINITION) تو بے معنی ہے؛ لہٰذا، سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟

کیریکٹر کی تعریف

علمی نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا تعلق اخلاقیات (ETHICS) سے ہے لیکن علمائے اخلاقیات بھی جس انداز سے کیریکٹر کی تعریف (DEFINITION)

بیان کرتے ہیں اس سے عام لوگوں کے لئے بات صاف نہیں ہوتی۔ مثلاً (SOREN KIERKEGAARD)
کے نزدیک :-

اخلاق، کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے۔ کیریکٹر درحقیقت داخلیت کا نام ہے۔ بداخلاقی بھی توانائی کی حیثیت سے کیریکٹر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ تو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور نہ ہی بُرے کا، تو وہ انسان نہیں حیوان ہے۔

(THE PRESENT AGE)

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے نزدیک کیریکٹر، صداقت (TRUTH) کے مظاہرہ کا نام ہے۔ اور جب ظاہر (APPEARANCE) حقیقت (REALITY) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو اسے صداقت کہتے ہیں۔ (ADVENTURE OF IDEAS)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ کیریکٹر درحقیقت خیر (GOOD) اختیار کرنے کا نام ہے۔
خیر کے معنی ہیں ایسا سفر جس میں ہر قدم منزلِ مقصود کی طرف اُٹھے اور شر کے معنی ہیں انسانی ممکنات بگولے کا سا رقص۔ (BETWEEN MAN AND MAN)

بالڈیو کے نزدیک "اپنے آپ پر قابو رکھنے کا نام کیریکٹر ہے" اس کی تائید (ALEXANDAR LOVEDAY) بھی کرتا ہے۔ (TAINT..) کا قول ہے کہ :-
انسانی ماحول کے متعلق انسان کا وہ رویہ جو مستقل ہو اور اس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا رہے، کیریکٹر کہلاتا ہے۔

(THE CONCEPT AND EDUCATION OF CHARACTER)

آپ نے دیکھا کہ کیریکٹر کی ان (DEFINITIONS) سے بات صاف نہیں ہوتی۔ آیئے ذرا عام فہم الفاظ میں دیکھیں کہ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے ؟

مال صدقۂ جان

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے ——— مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو ——— اس محاورہ کا پہلا حصہ بالکل واضح ہے۔ یعنی مال بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے انسان کو حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہو تو اس وقت جان کی حفاظت کے لئے مال کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے ——— یعنی جان کی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے ——— تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بڑا بلند ہے۔ نہ ہی اس شخص کے متعلق جو جان دے دیتا ہے لیکن پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست تھا۔ آپ نے اس بنیئے کا قصہ سنا ہوگا جو سخت بیمار ہو گیا اور اس کا بیٹا سول سرجن کو بلا لایا ——— اس لئے نہیں کہ اس کے علاج سے اس کے باپ کو شفا ہو جائے گی بلکہ اس لئے کہ برادری والے یہ نہ کہیں کہ اس نے باپ کا اچھی طرح علاج نہیں کرایا ———

سول سرجن نے مریض کو دیکھا۔ مرض کی تشخیص کی۔ پھر نسخہ لکھا جس میں مختلف قسم کی قیمتی دوائیں تجویز کیں۔ ڈاکٹر رخصت ہوا تو بیٹا نسخہ لے کر بازار کو چلا۔ باپ نے آواز دی اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بازار سے دوائیاں خریدنے جا رہا ہوں تاکہ علاج شروع کیا جائے۔ باپ نے کہا کہ یونہی بلا پوچھے گچھے نہ خرید لینا۔ پہلے پنڈت جی کے پاس جانا اور معلوم کرنا کہ "کریاکرم" (تجہیز و تکفین) پر کیا خرچ ہوگا۔ اور پھر دوائیوں کی قیمت دریافت کرنا۔ دونوں میں جو سستا ہو اُسے اختیار کرنا۔

آپ کو بنیئے کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آ جائے گی۔ لیکن آپ اس کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا کیریکٹر پست تھا۔ آپ یہی کہیں گے کہ وہ بڑا بیوقوف تھا۔ جان کی حفاظت (PRESERVATION OF SELF) ایک جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں جبلّی طور پر (BY INSTINCT) پایا جاتا ہے۔ چیونٹی کو دیکھئے۔ ننھی سی جان ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کے راستہ میں ذرا سی رکاوٹ بھی ڈالے جس سے اسے خطرہ محسوس ہو تو وہ اپنی حفاظت کے لئے کس قدر ہاتھ پاؤں مارتی ہے! یہ جذبہ تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر انسان بھی اپنی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے تو اس میں بلندیٔ اخلاق کی کوئی بات نہیں۔ یہ حیوانی سطح زندگی کے ایک جبلی جذبہ کا مظاہرہ ہے۔ جو انسان اس کے خلاف کرتا ہے اسے عقل و ہوش سے عاری سمجھا جاتا ہے ——— جو شخص اپنے آپ کو نقصان پہنچائے اُسے پاگل کہتے ہیں۔

جانِ صدقۂ آبرو

اب اس محاورے کے دوسرے حصے کو لیجئے۔ یعنی "جان صدقۂ آبرو" اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسا وقت آ جائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑ جائے۔ جب ان دونوں میں صرف ایک کو بچایا جا سکے تو پھر انسان کو چاہیئے کہ جان دیدے لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔ جو شخص آبرو کو بچانے کیلئے جان دے دیتا ہے۔ ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آبرو کو ہاتھ سے جانے دے اور اپنی جان بچا لے اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ جان بچانے کا جذبہ ہر انسان میں جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے جو شخص (مثلاً مال کی قربانی سے) جان بچا لیتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ اس کے برعکس آبرو کا تعلق حیوانی دنیا سے نہیں۔ حیوانات، آبرو کے تصوّر سے آشنا تک نہیں ہوتے۔ یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔

کیریکٹر کی تعریف

اس کا تعلق شرفِ انسانیت سے ہے۔ اس لئے جو شخص جان دے کر شرفِ انسانیت کو بچا لیتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ آبرو انسانی قدر (HUMAN VALUE) ہے۔ اس قسم کی اور اقدار بھی ہیں، جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔ ان اقدار کا تحفظ زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لے جاتا ہے۔

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ جو شخص کسی انسانی قدر کی حفاظت کے لئے اپنے طبعی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے اسے

کیریکٹر والا انسان کہتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اسی اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفظ کے لئے جان دے دینے والا، صاحب کردار کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق انسانیت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے میری آبرو رکھ لی تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے ہم عصروں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ لیکن آبرو کا ایک مفہوم ایسا ہے جو بہت نمایاں ہے۔ اس کا تعلق عفت و عصمت سے ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لئے جان تک دے دی تو اس سے عفت و عصمت ہی مقصود ہوتی ہے۔ آبرو کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے۔ اور پھر ان مثالوں پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں اگر کوئی بدباطن، کسی شریف زادی کے بُرقعے کی طرف بھی بُری نگاہ سے دیکھے تو اس لڑکی کا باپ یا بھائی اس شخص کے گولی مار دے گا۔ خواہ اس کے لئے اسے

آبرو کا معیار

پھانسی کے تختے پر بھی کیوں نہ چڑھنا پڑے ——— لیکن یورپ میں کوئی لڑکی اپنے آپ کو کسی نوجوان کی آغوش میں بھی کیوں نہ دے دے اُس کے باپ یا بھائی کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑے گی۔ بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ان کی لڑکی (یا بہن) سوسائٹی میں بڑی ہردلعزیز (POPULAR) ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا (BOY FRIEND) تلاش کر لیا ہے۔

اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ جو شخص کسی انسانی قدر (HUMAN VALUE) کی حفاظت کرتا ہے اسے کیریکٹر کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ "انسانی اقدار" ہر معاشرہ (SOCIETY) کی اپنی اپنی ہیں۔ ایک قدر جو ہمارے معاشرہ میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے، دوسرے معاشرہ میں اسے قدر سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اس کا مطلب یہ

مختلف اقدار ہیں

ہوا کہ مختلف معاشروں میں کیریکٹر کا معیار مختلف ہوگا اور ہم کسی چیز کو انسانی کیریکٹر یا عالمگیر کیریکٹر قرار نہیں دے سکیں گے۔ ہم ماں باپ کی اس قدر عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ لیکن ایسے قبائل بھی گذرے ہیں جو ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔ مقدس (PURITANS) حبشی بچوں کو جلا کے جلانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں ایک دوسرے سے سود لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بحرالکاہل کے قریب ایک قبیلہ ہے جس کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو اسے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹھگوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پُرفریب طریق پر قتل کر ڈالے[1]۔

نیشنلزم آج ساری دنیا کا مسلک اندازِ سیاست و اجتماعیت ہے۔ اس مسلک کی رُو سے جو شخص دوسری

---

[1] "انسان نے کیا سوچا؟" صفحہ ۱۳۴۔

قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان بہم پہنچائے اسے سب سے بڑا محبِ وطن سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مجسمے نصب ہوتے ہیں اور اس کا شمار بلند ترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ ([illegible]) کے الفاظ میں یہ ہے کہ :-

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کے تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہیئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز ہے۔ ؎۱

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ :-

(۱) کیریکٹر نام ہے انسانی اقدار کے تحفظ کا ــــــــ لیکن

(۲) یہ اقدار ہر معاشرہ میں مختلف ہیں حتیٰ کہ نیشنلزم کے مسلک کی رو سے اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ بلند ترین قدر ہے۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

لہٰذا، اس تصور کی رُو سے دنیا میں نہ کوئی عالمگیر مستقل اقدار ہیں اور نہ ہی کیریکٹر کا کوئی عالمگیر مستقل معیار۔ کیریکٹر کے معنی ہوں گے اُن اقدار سے ہم آہنگ رہنا جنہیں کوئی معاشرہ کسی وقت اپنے ہاں مستحسن قرار دے لے۔ سپارٹا میں چوری کرنا مستحسن خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہاں سب سے بڑا چور سب سے بلند کیریکٹر کا انسان تصور ہوتا تھا۔ آج چوری کرنا جرم ہے اس لئے اس لئے چور بدترین کیریکٹر کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کنواری لڑکی کا حاملہ ہو جانا سارے خاندان کی رسوائی کا موجب قرار پا جاتا ہے لیکن یورپ میں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے اختلاط نہ عیب سمجھا جاتا ہے نہ جرم۔ حتیٰ کہ اب وہاں تراضیٔ مابین سے لواطت کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وہاں قانوناً اجازت ہے۔

قرآنی نقطۂ نگاہ

یہ ایک نقطۂ نگاہ ہے۔ یعنی جب کسی بات کو کوئی معاشرہ معیوب قرار دے تو اس کا ارتکاب قابلِ نفرت اور مستوجبِ سزا ہوتا ہے۔ جسے وہ ایسا تصور نہ کرے، اس کا ارتکاب نہ بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے نہ موجبِ عقوبت۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نگاہ دوسرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے انسانوں کا طرزِ معاشرت اور اندازِ بود و باش مختلف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اقدار مختلف نہیں ہو سکتیں۔ انسانی اقدار ہر جگہ ایک ہی ہونی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہئیں جن میں کوئی ردّوبدل نہ کر سکے۔ یہ اقدار عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ آج یہ اقدار قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں جو تمام نوعِ انسان کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام کیریکٹر ہے۔ قرآن اسے "تقویٰ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ مغرب کے مشہور عالمِ اخلاقیات راشڈل ...... (HASTINGS RASHDAL) کے الفاظ ہیں :-

---

؎۱ "انسان نے کیا سوچا؟" صفحہ ۱۹۵۔

اخلاقیات سے مفہوم یہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے۔ جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔

(THE THEORY OF GOOD AND EVIL VOLII P286)

جیساکہ ہم نے اوپر کہا ہے یہ اقدار عقلِ انسانی کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ اس باب میں راشڈل کہتا ہے:۔

اس قسم کا اخلاقی قانون کسی انسانی شعور سے نہیں مل سکتا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان اخلاقیات میں کبھی ایک ہی نگاہ رکھیں گے۔ (ایضاً۔ ص۲۱۳)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان اقدار کا تعلق انسان کی انسانی سطحِ زندگی (HUMAN LEVEL OF LIFE) سے ہے۔ حیوانی سطح سے نہیں۔ حیوانی سطحِ زندگی کو طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کہہ لیجئے۔ قرآن اسے "حیوٰۃ الدنیا" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ جس سے مراد ہے ایسی زندگی جس میں انسان کی نگاہ قریبی یا پیش پا افتادہ مفاد پر ہی رہے۔ (لفظ دنیا کے معنی "قریب تر" کے ہیں) انسان کو اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں بڑی لذت ملتی ہے۔ (اگرچہ یہ لذت بڑی سطحی ہوتی ہے) قرآن کی رو سے ان لذات کا حصول بُری چیز نہیں وہ انہیں وجہِ جاذبیت قرار دیتا ہے۔ لیکن اصل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس سطحِ زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں (TIE) پڑتی ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص اس تقاضے کو ترجیح دے کر انسانی قدر کو قربان کر دیتا ہے تو وہ بلندیٔ کردار کا ثبوت نہیں دیتا۔ لیکن اگر وہ انسانی قدر کے تحفظ کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے کیریکٹر کہا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے......

اسے کیریکٹر کہیں گے

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! تم عدل و انصاف کی پوری پوری حفاظت کرو۔ شُهَدَاءَ لِلَّهِ۔ اگر تمہیں کسی معاملہ میں گواہی دینی پڑے تو اپنے اور بیگانے سب کے خیال سے بلند ہو کر صرف اللہ کے لئے شہادت دو۔ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف۔ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا۔ اس کا بھی خیال نہ کرو کہ جس کے حق میں تمہاری شہادت جا رہی ہے وہ امیر ہے یا غریب۔ قانونِ خداوندی، امیر اور غریب دونوں کا سب سے زیادہ محافظ ہے۔ لہٰذا خدا کا حق سب پر فائق ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا۔ دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اپنے مفاد۔ رشتہ داری کے تقاضے۔ یا دولتمندی کی وجاہت کا خیال، تمہیں انصاف سے روک دے۔ اس باب میں تم اپنے کسی جذبے کی پرواہ مت کرو۔ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۴/۱۳۵) ایسا بھی نہ ہو کہ تم شہادت دیتے وقت کوئی گول مول یا پیچدار بات کہو یا ویسے ہی ٹال جاؤ۔ یاد رکھو!.... اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔"

آپ دیکھئے کہ یہاں حیوانی اور انسانی اقدار میں کس طرح (TIE) پڑتی ہے۔ عدل کی پاسبانی اور اس کے لئے

بھی شہادت مستقل اقدار میں سے ہیں۔ اس کے برعکس، مفادِ خویش، اعزاء و اقرباء کے تعلقات کا خیال، فریقِ مخالف کی دولت اور وجاہت کے اثرات کا تصور، قدم قدم پر عنان گیر ہو رہا ہے کہ اگر سچی گواہی دی تو یہ نقصان ہوگا۔ وہ ضرر پہنچے گا۔ لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کشمکش میں جو شخص ان طبیعی تقاضوں کو ترجیح دے کر جھوٹی شہادت دیتا ہے، یا شہادت دینے سے پہلو تہی کرتا ہے۔ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ (قرآن اسے اتباعِ ہوی سے تعبیر کرتا ہے۔ ہوی کے بنیادی معنوں میں پستی کی طرف لے جانے کا مفہوم ہے)۔ لیکن جو شخص ان تمام امیال و عواطف کو نظر انداز کر کے حق کی گواہی دیتا ہے وہ بلند کردار کا حامل ہے۔ حیوانی جذبات اور انسانی اقدار کی یہ جنگ زندگی کے ہر دوراہے پر ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان دوراہوں پر آپ کا قدم کس طرف اٹھتا ہے۔

انسان ایسا کیوں کرے؟

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے طبیعی (حیوانی)، تقاضے کو قربان کر کے انسانی اقدار کی حفاظت کیوں کرے؟ طبیعی تقاضوں میں بڑی کشش و جاذبیت ہوتی ہے۔ دولت، ثروت، عیش و آرام کی زندگی، عزت اور نام کی شہرت۔ بلند مناصب و مدارج، قوتِ اقتدار، حکومت۔ ان سب میں بڑی جاذبیت ہے۔ ان کے مقابلہ میں، انسانی اقدار کے تحفظ میں کونسی لذت یا منفعت ہے۔ جس کی خاطر انسان ان تمام مفاد و منافع اور لذات و حظ نفس کو قربان کر دے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور جب تک اس کا اطمینان بخش جواب سامنے نہ آئے انسان اس قدر منافع و لذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آج دنیا میں جو اس قدر کیریکٹر کا فقدان نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ ذاتی مفاد کا خیال اس کے دل سے نکالا نہیں جا سکتا۔[1] وہ مفادِ خویش کی خاطر انسانی اقدار کی اس لئے پرواہ نہیں کرتا کہ اسے ان اقدار کی نگہبانی میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے اس امر کا یقین ہو جائے کہ انسانی اقدار کا تحفظ، حیوانی تقاضوں کی تسکین کے مقابلے میں زیادہ منفعت بخش ہے تو وہ یقیناً ان اقدار کے تحفظ کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو وہ آج اپنے حیوانی مفاد کے تحفظ کے لئے کرتا ہے ——— بلکہ اس سے بھی زیادہ ——— اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا۔ اتنے میں ایک آدمی گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اسے منہ کے قریب لے جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد، وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ یقیناً قاب اٹھا کر پھینک دے گا، وہ اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ

[1] مفادِ خویش کا تحفظ درحقیقت جذبۂ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کی شاخ ہے۔

اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیاں کا مقابلہ کرے گا اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کرلے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

اب اسی مثال میں اتنی سی تبدیلی کر لیجئے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو دوسرے شخص نے کہا کہ بھئی! یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہے حرام کی کمائی کا۔ اب سوچئے کہ وہ شخص اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا اسے اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ پلاؤ ضرور کھا لے گا اور اس بات کی ہزار تاویلیں کرلے گا کہ وہ ناجائز کمائی کا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے پلاؤ کھا لینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہو جائے گی تو وہ اسے اسی طرح اٹھا کر پھینک دیتا جس طرح اس نے سنکھیا والے پلاؤ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

سوال سارا یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں تصادم ہو جائے، اگر اس وقت انسان کو یہ یقین ہو کہ اس قدر کی حفاظت میں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ یقیناً اس کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے گا۔ آیئے کہ دیکھیں کہ اس مقصد کے لئے عام طور پر کیا کہا جاتا ہے۔ اور قرآن اس اہم گتھی کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ اخلاقیات کا سارا راز اسی میں ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جواب

جن لوگوں کے نزدیک انسانی اقدار اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں، سردست انہیں چھوڑ دیئے اور ان کی طرف آیئے جو ان اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر "مذہب پرست"[۱] یا خدا پرست کہا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن امور کو انسانی اقدار کہا جاتا ہے وہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت سے خدا خوش ہو جاتا ہے اور اگر اس کے احکام کو نہ مانا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے، اور مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہئے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس انداز کے جواب سے انسان اس زمانے میں تو مطمئن ہو سکتا تھا، جب اس کا ذہن ہنوز عہدِ طفولیت میں تھا، لیکن اب یہ جواب اس کے لئے وجہ اطمینان نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک بچے سے تو ڈرا دھمکا کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں بڑے آدمی سے نہیں منوا سکتے۔ بڑا آدمی اگر بعض حالات میں اس کے لئے آمادہ ہو بھی جائے تو بھی اس کا دل اس کے خلاف بغاوت کرتا رہے گا، اور اس موقع کی تلاش میں رہے گا کہ وہ ڈر کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو بات محض کسی کے ڈر سے کی جائے اس میں کیریکٹر کی بلندی کا کیا سوال؟ اگر کوئی شخص گرفتاری کے ڈر سے چوری نہیں کرتا تو اسے صاحبِ کردار نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا مذہب پرست طبقہ کا یہ جواب، اس مقصد کے حصول کے لئے اطمینان بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل مذہب کی گرفت دلوں پر سے ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

---

[۱] اسلام 'دین' ہے مذہب نہیں۔ اس لئے اسلام کا شمار مذاہب میں نہیں ہوتا۔ لیکن اسے اب مذہب ہی سمجھا جاتا ہے۔

مفکرین کا طبقہ

دوسرا طبقہ مفکرین کا ہے۔ اس باب میں ان کا کیا خیال ہے، اس کے متعلق بہت سے مفکرینِ مغرب کے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے بات لمبی ہو جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں ایک آدھ مفکر کا نظریہ پیش کر دیں تو مقصد پیشِ نظر کے لئے وہی کافی ہوگا۔ مغربی مفکرین میں جو مقام کانٹ کو حاصل ہے وہ اربابِ فکر سے پوشیدہ نہیں —— کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کی ساری عمارت انسان کے نیک ارادے (GOOD WILL) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

> اس دنیا میں، بلکہ اس سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں جسے بلامشروط خیرِ محض کہا جا سکے، سوائے نیک ارادے کے۔

اور نیک ارادے کی تعریف (DEFINATION) کانٹ کے نزدیک یہ ہے کہ:-

> وہ ارادہ جو کسی کام کو محض اس لئے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (DUTY) ہے۔

یعنی ہر قسم کے افادی تصوّر سے بے نیاز ہو کر، فرض کو محض فرض سمجھ لینا کرنا، نیک ارادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس عمل میں (خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرہ بھر بھی صلہ کی امید یا معاوضہ کا تصوّر شامل ہو جائے وہ عمل، عملِ خیر نہیں رہتا۔ اس کے نزدیک عملِ خیر کی قیمت وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل آتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کانٹ کے نزدیک، اصول بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے آمادۂ عمل کریں۔ انہیں کانٹ مادی اصول (MATERIAL MAXIMS) قرار دیتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصور کے بغیر آمادۂ عمل کریں۔ ان کا نام۔ ان کی اصطلاح میں (A PRIORI MAXIMX) ہے۔ اس کے نزدیک یہ اصول انسان کے اندر، فرض (DUTY) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اصول کو وہ امرِ غیر مشروط (CATEGORICAL IMPERATIVE) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

> امرِ غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا حصول مقصود نہ ہو بلکہ وہ کام اپنی ذات میں واجب العمل ہو۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے اگر عام فہم الفاظ میں بیان کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ انسانی اقدار انسان کے فرائض ہیں۔ انہیں انسان کو فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے۔ نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ان کے "فرائض" ہونے کیلئے نہ کوئی دلیل دی جا سکتی ہے (A PRIORI کے یہی معنی ہیں)۔ اور نہ ہی ان فرائض کی سرانجام دہی سے کسی صلہ یا معاوضہ کی توقع رکھنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ فکری طور پر کتنا ہی بلند آہنگ اور خوش آئند کیوں نہ ہو، انسان کے دل میں ایسا جذبہ نہیں ابھار سکتا جس سے وہ مادی مفاد اور طبعی لذات کو قربان کر کے۔ انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے آمادۂ عمل ہو جائے۔ اس کے لئے کسی بہت بڑے جذبۂ محرکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انسان "مفادِ خویش" کے خیال سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ (ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہو کر) کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا، جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا میں نہ فلاسفرز کے بلند آہنگ نظریات اور نہ

تارک الدنیا اربابِ تصوف کے کیف آور پند و نصائح انسانوں کو "مفادِ خویش" سے بے نیاز کر کے مستقل اقدار کے محافظ بنا سکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود رہی ہے، زندگی کا مسلک نہیں بن سکی۔ ان میں زندگی کا عالمگیر مسلک بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ زندگی کا عالمگیر نظریہ اور مسلک بننے کی صلاحیت صرف اس اصول میں ہے جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کی رُو سے زندگی کے دو نظریے (۲)

قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس طبعی زندگی ہے۔ یہ طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے، اور انہی قوانین کے تابع ایک دن اس کے جسم کی مشینری چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے اسے موت کہتے ہیں۔ اور موت کے ساتھ اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ زندگی کے مطابق انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا اور انسان کے سب تقاضے حیوانی سطح زندگی کے تقاضے رہ جاتے ہیں۔ اس میں انسانی اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانوں کے مل جل کر رہنا ہے اور اس طرح رہنے سے ان کے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سوسائٹی ایسے قوانین و ضوابط مرتب کرتی رہتی ہے جن سے ان تصادمات کا امکان کم ہو جائے۔ جو شخص ان قوانین و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اُسے پُرامن شہری کہا جاتا ہے جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ عدالت میں سزا پاتا ہے یا سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ حیات کی رُو سے

(i) سوسائٹی کے پاس کوئی مستقل اقدار یا اصول نہیں ہوتے۔ وہ جس قسم کے قوانین و ضوابط مناسب سمجھے وضع کر لے۔ اور جب چاہے ان میں تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کر لے۔

(ii) ان قوانین و ضوابط کے اتباع کے لئے جذبۂ محرکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے عدالت سے سزا مل جائے گی یا انسان سوسائٹی کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہٰذا

(iii) اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے لیکن عدالت کی گرفت میں نہ آئے یا سوسائٹی اس کا محاسبہ نہ کرے تو پھر اسے ان قوانین کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

(iv) اس سوسائٹی میں کیریکٹر کی بلندی کا معیار صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان ذاتی مفاد کو قوم اور ملک کے مفاد پر ترجیح نہ دے۔ ان کے ہاں قوم فروشی، قانونی جرم بھی ہوتا ہے اور سوسائٹی کی نظروں میں معیوب بھی۔ لیکن اگر کسی ملک میں قانونی نظام کمزور ہو جائے اور مفادِ خویش کا جذبہ ایسا عام ہو جائے کہ سارے کا سارا ملک اس رَو میں بہہ نکلے، تو پھر نہ کوئی قوت ایسی رہتی ہے جو افرادِ قوم کو اس لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ سکے اور نہ کوئی جذبۂ محرکہ ایسا جو ان کے اندر کیریکٹر کے احساس کو بیدار کر سکے۔

اس وقت دنیا جس جہنم میں سے گذر رہی ہے، اس کی وجہ، زندگی کا یہی تصوّر ہے۔ اسے سیکولر نظریۂ حیات کہا جاتا ہے۔ جن قوموں میں قومی مفاد کا شعور بیدار ہے وہ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کے لئے عذاب بن رہی ہیں،

اور جن میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا وہ ایسے جذام میں مبتلا ہیں جس سے وہ اپنے آپ سے بھی نالاں ہیں اور ساری دنیا بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔

کیریکٹر کی اس تعریف (DEFINATION) کی رو سے، جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس تصورِ حیات کے مطابق کسی شخص میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر انسان (یا انسانوں کا گروہ) اپنے طبعی مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ جب دو (طبعی) مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو تو وہ دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور زیادہ فائدے کو تھوڑے فائدے پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے آپ منفعت اندیشی کہیں گے، کیریکٹر نہیں کہیں گے۔ حتیٰ کہ اس تصور کے ماتحت اگر کوئی شخص قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی اپنے ایک زیادہ قیمتی طبعی تقاضے کو کم قیمتی طبعی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر پیش کی جائے گی)۔

دوسرا تصوّرِ حیات

یہ تھا ایک تصوّرِ زندگی اور اس کے نتائج و عواقب۔ قرآن کی رُو سے دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا نفس کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشو و نما ہے۔ چونکہ اس کی نشو و نما کے لئے جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ ساتھ جسمانی نشو و نما بھی ضروری ہے۔ لیکن جسمانی نشو و نما، ذات کی نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات انسانی ذات کی نشو و نما ہی ہے۔

آپ کسی انسان کے دل کو ٹٹولیئے اور دیکھئے کہ اس کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کیا ہے؟..... آپ دیکھیں گے کہ انسان کی سب سے زبردست خواہش یہ ہے کہ وہ زندہ رہے۔ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ تحفظِ خویش اس کی جبلّت کا تقاضا ہے اور اس کی عقل وہ تمام سامان و ذرائع بہم پہنچاتی ہے۔ جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآن نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپا۔ وہ اس کے پاس گیا اور نہایت مشفقانہ انداز میں کہا کہ کیا تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور ایسا اقتدار مل جائے جسے کبھی زوال نہ ہو؟ یہ آدم (آدمی) کے دل کی خواہش تھی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور ابلیس سے کہا کہ مجھے ضرور ایسا نسخہ بتاؤ۔ ابلیس نے کہا کہ تم اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعہ زندہ رہ سکتے ہو۔ اس سے تمہارے نام کو حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ ابلیس کا یہ افسوں کس درجہ کارگر ہوا، اس کا ثبوت روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ جس عمر رسیدہ آدمی کے ہاں اولاد (بالخصوص نرینہ اولاد) نہیں ہوتی، دیکھئے کہ وہ بیٹے کی پیدائش کے لئے کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ ہر سانس میں کہتا ہے کہ اگر میں اسی طرح مر گیا تو میرے گھر کا چراغ گل ہو جائے گا۔ میرا نام و نشان مٹ جائے گا۔ میرے نسب کا شجرہ منقطع ہو جائے گا۔ میرے خاندان کی جڑ کٹ جائے گی۔

لیکن خدا نے انسان سے کہا کہ یہ ابلیس کا فریب ہے۔ یہ مادی تصورِ حیات کا افسوں ہے۔ باپ کی زندگی اپنی ہے۔ اولاد کی اپنی۔ اولاد کے زندہ رہنے سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی۔ حیاتِ جاوید حاصل ہونے

کا طریقہ کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشو و نما ہو جائے تو انسان کی طبعی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے ـــــــ انسان کو حیاتِ جاوید، انسانی ذات کی نشو و نما سے مل سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ہے

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

پھر قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ زندگی کی موجودہ سطح پر ذات کی نشو و نما، جسم کے ذریعہ ہوتی ہے، اس لئے انسانی جسم کا تحفظ اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے انڈے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشو و نما ہو جائے تو اس کے اندر مضمر حیات، ایک جیتے جاگتے چوزے کی شکل اختیار کر لے لیکن اس کے لئے انڈے کے خول کا محفوظ اور مضبوط ہونا ضروری ہے۔ لیکن انڈے کا خول بہرحال انڈے کی امکانی صلاحیتوں کے بار ومند ہونے کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ جونہی وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، یعنی بچہ بن جاتا ہے۔ خول کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے اور اس کے اس طرح ٹوٹ جانے سے بچہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اسی طرح انسانی جسم، اس کی ذات کی نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ ذات کی نشو و نما کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ جس طرح انسانی جسم کی نشو و نما کے لئے طبعی قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں۔ ان قوانین کو انسانی اقدار یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار وحی کے ذریعہ ملتی ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جس طرح جسم کی پرورش کے قوانین عالمگیر ہیں اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی عالم گیر ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو شخص اس تصورِ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی (اور زاویۂ نگاہ) میں اور اس شخص کی زندگی (اور زاویۂ نگاہ) میں جو سیکولر تصورِ حیات رکھتا ہے، کتنا وسیع اور گہرا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

(i) سیکولر تصورِ حیات کی رو سے انسان کی طبعی زندگی اور تقاضے مقصود بالذات ہوتے ہیں، اس لئے اس کے سامنے نہ طبعی تقاضوں سے بلند کوئی اور تقاضا ہوتا ہے اور نہ ہی طبعی قوانین سے بالاتر کوئی قوانین اور اقدار۔ لیکن

(ii) قرآنی تصورِ حیات کی رو سے، انسانی جسم اور اس کے تقاضے، مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ ایک بلند مقصد (استحکامِ ذات) کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

(iii) قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے جسم کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن جب کبھی جسم کے کسی تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے (یا طبعی تقاضہ یا مستقل اقدار کے تقاضہ) میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ ذات کے تحفظ کے لئے جسمانی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی صاحب عقل و ہوش ذریعے کو بچانے کے لئے مقصد کو قربان نہیں کرتا۔ جب اس شخص نے سنکھیا والے پلاؤ کو پھینک

دیا تھا تو ہر چند عام حالات میں کہ پلاؤ، اس کی جان بچانے کا ذریعہ تھا۔ لیکن جب وہ ذریعہ اس کی جان کی ہلاکت کا موجب بن گیا تو اس نے جان کی خاطر، ذریعہ کو چھوڑ دیا۔

(iv) قرآنی تصورِ حیات پر ایمان رکھنے والا، مستقل اقدار کی حفاظت، کسی کا حکم یا فریضہ سمجھ کر نہیں کرتا۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہ طبعی تقاضہ اور مستقل اقدار کے ٹکراؤ کے وقت، دونوں میں موازنہ کرتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے کس کے تحفظ میں اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ طبعی تقاضا کے تحفظ میں طبعی (لہٰذا عارضی) حیات کا فائدہ دیکھتا ہے۔ اور مستقل قدر کے تحفظ میں، انسانی (لہٰذا دائمی) حیات کا فائدہ۔ لہٰذا خود اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ فائدہ کی خاطر کم فائدہ کو قربان کر دے۔ اقبالؒ صرف طبعی تقاضوں کا تحفظ کرنے والی عقل کو، "عقلِ خود بین" اور طبعی اور انسانی ذات دونوں کے تقاضوں کا تحفظ کرنے اور ان میں موازنہ کرنے والی عقل کو، "عقلِ جہاں بین" کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن، طبعی تقاضوں کو قریبی زندگی (حیٰوۃ الدنیا) کے مفاد، اور انسانی ذات کے تقاضوں کو مستقبل (آخرت) کے مفاد سے تعبیر کرتا ہے اور مومنین کو اولوالالباب کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی بلند سطح کی عقل کے حامل انسان۔

(v) اس سے ظاہر ہے کہ مستقل اقدار کا تحفظ، خود انسان کی عقل کا تقاضہ ہو جاتا ہے۔ انسانی عقل ہمیشہ مفادِ خویش چاہتی ہے۔ جب وہ دو مفادات میں موازنہ کرتی ہے تو وہ بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیتی ہے۔ حیوانی سطحِ زندگی پر انسان کی عقل کا درجہ پست ہوتا ہے ...... انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ مومن کی عقل، بلند سطح کی عقل ہوتی ہے۔

(vi) جو کام عقلِ خود بین کے تقاضے سے کیا جائے اسے (عام اصطلاح کے مطابق) عقل مندی کہا جائے گا۔ لیکن جو کام عقلِ جہاں بین کے تقاضے سے کیا جائے اسے عقل مندی اور کردار دونوں کا مجموعہ قرار دیا جائے گا۔ مومن کے ہاں ایمان اور عقل میں قطعاً مغائرت نہیں ہوتی۔ چونکہ سیکولر نقطۂ نگاہ کی رو سے طبیعی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہوتی اس لئے ان کی زبان میں عقلِ خود بین اور عقلِ جہاں بیں کے لئے الگ الگ الفاظ ہی نہیں تھے۔ اب ماہرینِ علم النفس بلکہ علم تجزیۂ نفس (PSYCHO ANALYSIS) نے دو الگ الگ اصطلاحات وضع کی ہیں۔ ایک وہ عقل جو انسان کے طبیعی تقاضوں کے حصول اور ان کی تائید میں دلائل فراہم کرے۔ وہ اسے (RATIONALISING INTELECT) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور دوسری وہ عقل جو انسانی نفس کے حق میں دلائل فراہم کرتی ہیں وہ اسے (REASON) کہہ کر پکارتے ہیں۔ اقبالؒ نے ان کے لئے پہلے ہی دو اصطلاحات وضع کر دی تھیں۔ اوّل الذکر کے لئے "دانشِ برہانی" اور ثانی الذکر کے لئے "دانش نورانی"۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ جب تک انسان اس تصورِ حیات پر ایمان نہ لائے (اس کی صداقت کا یقین نہ کرے) کہ:

(i) انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے جس کی نشوونما

ایمان کی ضرورت

مقصودِ زندگی ہے۔

(ii) ذات کی نشوونما کے لئے اسی طرح قوانین مقرر ہیں جس طرح جسم کی پرورش کے لئے ان قوانین کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

(iii) یہ مستقل اقدار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ اور

(iv) انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔

اُس وقت تک اُس کیریکٹر کا سوال ہی سامنے نہیں آتا جس کا تعلق عالمگیر شرفِ انسانیت سے ہے۔

راشدؔ لکھتا ہے کہ مستقل اقدار ماننے کے لئے

(۱) سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات بلا مقصود نہیں پیدا کی گئی۔ بلکہ اس کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ یہ وہ سامان فراہم کرے جس سے انسانی ذات منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔

(۲) دوسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسانی ذات

(ا) ایک مستقل حقیقت ہے۔

(ب) اس کی اپنی مستقل زندگی ہے۔ یعنی مادی جسم کے تغیرات اس پہ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

(ج) یہ اپنے تمام افعال کی سبب آپ ہے۔

(۳) تیسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان کے موجودہ عمل اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال "آج" ہوں گے اسی قسم کا اس کا "کل" ہوگا۔ بالفاظِ دیگر اس کے لئے تسلسلِ حیات پہ ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں۔ اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان، زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ ورنہ جو شخص یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ ہی میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

(۴) اور سب سے ضروری یہ کہ خدا پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لئے کہ اخلاقی آئیڈیل، نفس (MIND) کے علاوہ اور کہیں موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ اور ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل، نفسِ مطلق میں ہی موجود ہو سکتا ہے جو ہر حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۲۰-۲۰۰)

آپ نے غور کیا کہ کیریکٹر کے لئے ایمان، کس قدر لاینفک شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ "عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" سے پہلے "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہتا ہے۔

اب آپ اس نکتہ کی طرف پھر آجائیے جسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ایسے کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ وہ شخص دفتر میں کام کرتے ہیں ——— اس لئے کہ اس سے انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں ان کا فائدہ ہے ——— ایک کاروباری آدمی کچھ خلافِ قاعدہ مراعات حاصل کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی رقم بطور رشوت پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ رشوت کی رقم فوراً قبول کرے گا۔ بشرطیکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہیں

آئے گا۔ وہ رشوت اس لئے لے لے گا کہ اس میں اس کا مالی فائدہ ہے ـــــــ وہ شخص جو انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے کبھی رشوت قبول نہیں کرے گا اس لئے کہ اسے دیانتدار رہنے میں فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رشوت لینے سے اسے طبعی فائدہ ہوگا لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ دوسری طرف رشوت نہ لینے سے اس کا طبعی نقصان تو ہوگا لیکن اس کی ذات کا فائدہ ہوگا۔ وہ طبعی فائدہ اور ذات کے فائدہ میں موازنہ کریگا اور چونکہ اس کے نزدیک ذات کا فائدہ بہرحال دبہرکیف زیادہ گراں بہا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ فائدے کے لئے کم فائدے کو ٹھکرا دے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایمان سے انسان کے "مفادِ خویش" کے جذبہ کی تسکین بھی کس طرح ہو جاتی ہے۔ اِس وقت اس کا جذبۂ محرکہ بھی "مفادِ خویش" ہی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ مفاد اور مَفاد میں فرق کرتا ہے۔

مفاد اور مَفاد میں فرق

وہ طبعی جسم کے فائدے کے مقابلے میں ذات کے فائدے کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ اس لئے کم فائدے سے صرفِ نظر کرکے زیادہ فائدے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس لئے وہ رشوت کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اس کام کو نہ تو اس لئے کرتا ہے کہ یہ کسی کا "حکم" ہے اس لئے اس کی تعمیل ضروری ہے۔ نہ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ اسے اس لئے کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس میں ڈر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ڈر ہوتا ہے اپنی ذات کے نقصان کا ـــــــ جس طرح زہر آلود پلاؤ کھانے والے کو ڈر ہوتا ہے اپنی جان کی تباہی کا ـــــــ اسے قرآن کی رو سے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا۔

آپ نے غور کیا کہ انسانی ذات پر ایمان انسان کو کس طرح ہر آن حسنِ عمل (کیریکٹر کے مظاہرہ) پر آمادہ کئے چلا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک، مردِ مومن، حسنِ عمل کسی صلہ یا معاوضہ کی خاطر نہیں کرتا تو اس سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ وہ عمل کا صلہ یا معاوضہ، طبعی یا حیوانی پیمانوں میں نہیں مانگتا۔ اسے اس کا صلہ ذات کے پیمانوں کے مطابق ملتا ہے۔ مَآ اَسْئَلُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰہِ۔ (۲۶/۱۰۹) سے یہی مراد ہے[1]۔ عمل کوئی بھی ہو وہ بلاصلہ یا بلامعاوضہ کبھی نہیں رہتا۔ صرف معاوضہ اور معاوضہ میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک قانون (مستقل قدر) یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر زیادہ دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے وہ پوری محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے صرف اتنا اپنے لئے رکھتا ہے جس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہوں۔ اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے۔ (قرآن کریم نے انسانی

---

[1] اس کے یہ معنی نہیں کہ مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے طبعی مفاد ملتے ہی نہیں۔ ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کرنے سے اس دنیا کے طبعی مفاد بھی بڑی عمدگی سے حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ۔ کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی دنیاوی زندگی بھی، خوشگوار اور آخری زندگی بھی خوشگوار۔

ذات کی نشو و نما کا یہ طریق بتایا ہے) ظاہر ہے کہ طبعی پیمانوں سے ماپئے تو اس میں اس شخص کا سراسر نقصان ہے۔ یہی ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا وہ دوسروں کے پاس چلا جائے گا تو وہ اتنا کمائے گا ہی کیوں جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ وہ تھوڑی سی محنت کر کے اپنی ضروریات کے مطابق کما لے گا اور پھر چین سے سوئے گا۔ ان لوگوں کی یہ دلیل بڑی معقول نظر آتی ہے اور اس کا اطمینان بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وہ مشکل ہے جو کمیونسٹ ممالک میں پیش

روس کی مشکل

آرہی ہے۔ اس سوال کا جواب صرف قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے مل سکتا ہے اور یہی ہے وہ مقام جہاں قرآنی نظام، دیگر نظام ہائے معیشت و معاشرت سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام کی حامل، مومنین کی جماعت ہوتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کی جماعت جو اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں کہ:-

(i) انسانی ذات کی نشو و نما مقصودِ حیات ہے۔ اور

(ii) ذات کی نشو و نما اس سے ہوتی ہے کہ انسان پوری پوری محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد جس قدر ہو اسے نوعِ انسان کی پرورش کے لئے عام کر دے۔

ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے کس قدر تڑپ ہوتی ہے، ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جو ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے اس کی انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ دودھ پیدا ہو تاکہ اس کا بچہ بھوکا نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا دودھ اس غذا سے

مومن ایسا کیوں کرتے ہیں؟

بنتا ہے جو وہ اپنے جسم کی پرورش کے لئے کھاتی ہے۔ لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی کہ یہ غذا اس کے بدن کا جزو بن جائے۔ اور دودھ میں تبدیل نہ ہو۔ اس کے برعکس، اگر کبھی اس کے دودھ میں کمی واقع ہو جائے تو وہ ڈاکٹروں سے مشورہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کی غذا (زیادہ سے زیادہ حد تک) دودھ میں تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے؟ محض اس لئے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن چکی ہوتی ہے۔ اس سے اس کے قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا ایمان یہ ہو کہ دوسروں کی پرورش سے ان کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ کماتے ہیں۔ اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59/9) دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح مامتا کی ماری ماں خود بھوکی رہتی ہے لیکن اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتی ہے۔ خود گیلے بستر پہ سوتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پر لٹاتی ہے۔ جس طرح اس ماں کے دل میں اس وقت کسی معاوضہ یا صلہ کا خیال نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جن کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76/9) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ تک کے متمنی۔ اس مثال میں فرق

یہ ہے کہ ماں بچے کے لئے یہ کچھ اس جبلی تقاضے کے ماتحت کرتی ہے جو ہر حیوان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ہر حیوانی ماں بھی وہی کچھ کرتی ہے جو انسانی ماں کرتی ہے۔ لیکن بندۂ مومن یہ کچھ عقل و فکر کی رُو سے اور اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن اپنے اس نظام کی عمارت استوار کرتا ہے جس میں کیریکٹر خود بخود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مملکت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ تمام

عملی طریق

افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کا سامان فراہم کرے۔ اس سے انسانی سیرت کی وہ تمام کمزوریاں رفع ہو جاتی ہیں جو اضطراب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو کیریکٹر کی پستی کا موجب بنتی ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر فردِ معاشرہ کے دل میں اس ایمان کو راسخ کرتا ہے (وہ راسخ کیا کرتا ہے۔ معاشرہ مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اس ایمان کے حامل ہوں[1]) کہ وہ جس قدر محنت کر کے کمائیں گے اور جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو اُسے دوسروں کی نشو و نما کے لئے دے دیں گے اسی قدر ان کی اپنی ذات کی نشو و نما ہو گی۔ اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں جو دولت جمع کرنے کی ہوس یا افراطِ زر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس نظام میں نہ فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے ..... نہ مفاد پرستی کے جذبات انسانی سیرت کو داغدار کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کمیونزم کے نظام کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) افراد کے پاس نہیں رہنے دے گا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کی لعنتوں کو ختم کر دے گا۔ لیکن کمیونزم کا نظام مادی تصورِ حیات پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں وہ جذبۂ محرکہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی ضروریات

کمیونزم کی بنیادی کمزوری

سے زائد سب کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے بطیبِ خاطر دیدے۔ یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے کمیونزم کا نظام نہ قائم رہ سکتا ہے، نہ آگے بڑھ سکتا۔ اسے صرف استبداد کے زور پر قائم رکھا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد کے ڈنڈے سے قائم کردہ نظام، زیادہ دنوں تک چل ہی نہیں سکتا۔ وہی نظام قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افرادِ معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہ چیز قرآن کے پیش کردہ تصورِ حیات کے علاوہ اور کہیں ممکن نہیں۔ کمیونزم جس تصورِ حیات کی تخلیق ہے اسے قرآن (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں)۔ حیوانی سطحِ زندگی قرار دیتا ہے۔ جس میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تصورِ حیات کی رُو سے مادی مفاد

نیشنلزم کا جذبہ

سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اس میں آپ زیادہ سے زیادہ نیشنلزم کا جذبہ ابھار کر، افرادِ معاشرہ کو انفرادی مفاد سے قومی مفاد کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ (مغربی نظریۂ جمہوریت کی رو سے) نیشنلزم کی بنیاد قوموں کے باہمی جذبۂ منافرت پر ہے اور ایک قوم جانتی ہے کہ اگر مجھ میں کمزوری آگئی تو قومیں مجھے ہڑپ کر جائیں گی۔ اس لئے جس چیز کو نیشنلزم میں قومی کردار کہا جاتا ہے وہ بھی تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کے جذبہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ کسی انسانی

---

[1] وہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے دل میں شروع سے یہ تصور راسخ ہوتا چلا جائے۔

قدر کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں ایک فرد کے بجائے، افراد کا مجموعہ اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفظِ خویش اچھی چیز نہیں اور کسی قوم کو اپنے ملک کی حفاظت نہیں کرنا چاہیئے۔ تحفظِ خویش نہایت ضروری ہے اور اپنے وطن کی حفاظت تحفظِ خویش کے لئے لاینفک۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تحفظِ خویش کے لئے (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کوشش کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کسی بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے متعلق یہ ہی کہنا چاہیئے کہ وہ عقل مندی اور دانش اطواری کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنا تحفظ نہیں چاہتا (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ وہ بڑا احمق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی شخص، کشتی میں بیٹھا ہوا، کشتی میں سوراخ کر رہا ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں کیریکٹر کی کمی ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔ جو شخص وطن میں رہتے ہوئے اس وطن کی تخریب چاہتا ہے، اس کا شمار پاگلوں میں ہوگا۔ لہٰذا نیشنلزم میں اگر کوئی شخص وطن کے مفاد کو، مفادِ خویش پر ترجیح دیتا ہے تو اُسے نہایت سمجھدار اور ہوشمند کہا جائے گا۔ (جس طرح اگر کوئی شخص کشتی کا سوراخ بند کرنے کے لئے اپنا قیمتی رومال اس میں ٹھونس دے تو اسے عقل مند کہا جائے گا)۔ صاحبِ کردار وہ ہوگا جو کسی ڈوبتے کو بچانے کے لئے دریا میں کود جائے، اور یہ چیز صرف بلند اور مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جنہیں بلند اقدار کا احساس و شعور بھی نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ ڈوبتوں کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ وہ اس بلند قدر کا غیر شعوری طور پر احساس رکھتے تھے اور یا ان کا جذبۂ محرکہ کچھ اور تھا۔ صاحبِ کردار وہی ہے جو دو اقدار کا شعوری طور پر موازنہ کرے اور پھر بلند قدر کی حفاظت کے لئے اس سے پست درجہ کی قدر کو علیٰ وجہ البصیرت قربان کر دے۔ یہ چیز قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار پر ایمان لانے سے ہی ہو سکتی ہے۔ یہ کمیونزم یا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ قرآن پر ایمان رکھنے والے اگر اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ذاتی مفاد

مردِ مومن کا جذبۂ تحفظِ وطن

کی پرواہ نہیں کرتے تو اس لئے نہیں کہ ملک کے تحفظ سے ان کا اپنا تحفظ ہو جائے گا بلکہ اس لئے کہ وہ ملک کو ان بلند اقدار کے بروئے کار لانے اور دنیا میں عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور اس کا تحفظ اس لئے چاہتے ہیں کہ اس سے مستقل اقدار کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر وہ ملک کی حفاظت و استحکام کے لئے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے تو ان کا یہ عمل بھی اپنے طبعی تقاضے پر مستقل اقدار کو ترجیح دینے کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ان کے کیریکٹر کی بلندی کی دلیل ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ ایک مادہ پرست کے جذبۂ تحفظِ وطن اور ایک مومن کے جذبۂ تحفظِ وطن میں کس قدر بنیادی فرق ہے؟ مادہ پرست کے نزدیک وطن مقصود بالذات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔ لیکن مردِ مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ مستقل اقدار کے تحفظ و تنفیذ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا تحفظ بھی ہو جاتا

ہے۔ جس طرح قرآنی نظام میں انسانی ذات کے استحکام کے ساتھ ساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے اس کے نزدیک مقصودِ زندگی ان اقدار کا تحفظ ہے۔ باقی سب کچھ اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب وہ ان ذرائع کے تحفظ و استحکام کی خاطر اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ درحقیقت ان مستقل اقدار کے تحفظ و استحکام کے لئے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مومن کے دنیاوی کام بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مملکتِ پاکستان کے حصول کا مقصد یہی تھا کہ اس میں ایسا نظامِ زندگی قائم کیا جائے جس سے افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مملکت کا حصول مقصود بالذات نہیں تھا۔ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اس سے اگر طبیعی مفاد (سیاسی، معاشی وغیرہ مفادات) حاصل ہوتے تھے تو وہ اس نظام کا فطری نتیجہ تھے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام انہی افراد کے ہاتھوں قائم ہو سکتا تھا جن کا زاویۂ نگاہ قرآنی ہو۔ یعنی جو انسانی ذات اور اس کی نشوونما کو اپنی زندگی اور اس مملکت کا مقصود و منتہیٰ سمجھیں۔ مملکت کے اقتدار کا اِس پارٹی یا اُس پارٹی کے ہاتھ میں ہونے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میں فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ کیا مملکت کا اقتدار ان افراد کے ہاتھوں میں ہے جو قرآنی تصورِ حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کو زندگی کا مقصد! اگر ایسا نہیں تو حکومتوں کی تبدیلی اور پارٹیوں کے ردّ و بدل سے وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا جس کیلئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ یہی وہ حضرات ہوں گے جنہیں صاحبِ کردار (کیریکٹر والے لوگ) کہا جائے گا اور انہی کے برسرِ اقتدار آنے سے معاشرہ کی ہر قسم کی برائیوں کا خاتمہ ہو سکے گا۔ یہ چیز مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے جو راہنما برسرِ اقتدار آتے رہے ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ساتھ میری راہ و رسم تھی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہماری موجودہ قوم جیسی تیسی بھی ہے اس کے ذمے تو صرف یہ فریضہ عائد کیا جائے کہ اس خطۂ زمین کو محفوظ رکھیں۔ لیکن آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ قرآنی تصورِ حیات ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس طرح وہ ایک مثالی صاحبِ کردار قوم بن کر اُبھرے۔ مجھ سے اتفاق تو ان سب نے کیا لیکن (افسوس کہ) عملی قدم کسی نے بھی نہ اٹھایا۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان (ضربِ کلیم)

(۳۔ جنوری سنہ ۱۹۷۸ء)

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(۱) بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلا وجہ تاخیر نہ ہو۔

(۲) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اسی صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

دُرِّ منثور

انسے گہرہائے تابدار ہیں سے چند جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریرات نثر ہیں سے جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

نسل پرستی

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے دقیانوسی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہو گا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قوتوں کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔ (احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

قومیت

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے، جسے اس نے تشکیل کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصولِ وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ (خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

مذہب اور سیاست

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتہً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالمِ بشریت کو متحد و

منظم کرتا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک اُمّت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ (مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جواب میں بیان ۱۹۳۸ء)

شریعت کا مقصود

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

دورِ انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء فلاسفر، سیاسیئن وغیرہ ہم کو ایک نئی تحریک خیال سے اُبھارتا ہے چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انھیں خوشنما آئندہ درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رجائیت کے بنگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو شل، اور ان کی روحانی قوتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علامات زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بخشیں۔ اس کے تصوّرات اور اس کے واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں، اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیاتِ روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو و نما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ (احمدیت سے متعلق — اخبار لائٹ کے جواب میں)

اسلام پر نازک وقت

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔
(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

قرآن کی کاملیت

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔
(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

دورِ حاضر کا مجدد

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط ۱۹۲۵ء)

محاورہ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ملت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں حمیت موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط ۱۹۳۷ء)

نازک وقت

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاحِ لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۲۶ء)

اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۲۶ء)

فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

لیڈروں کا فقدان

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے، جو اسلام کی روح اور مقدر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرکہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کرتے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

احترام آدمیت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

وحدتِ انسانیّت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوعِ انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

قومیّت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو قابلِ احترام ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

وطنیّت

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کے لئے فیصلہ

مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک محدود رہے گی یا مسلمان عوام کی نمائندگی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ (قائدِ اعظمؒ کے نام خط ۱۹۳۷ء)

لیگ کا مستقبل

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے، مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرزِ آئین کو کما حقہ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے۔ تو کم از کم ہر ایک کا حقِ معیشت محفوظ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔ (قائدِ اعظمؒ کے نام خط ۱۹۳۷ء)

مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ خونریزی۔ سفاکی۔ کمزوری اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں۔ کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)